غنچۂ تبسم

نگارش

تمکین کاظمی

پندارِ نیک   گفتارِ نیک   کردارِ نیک

غنچۂ تبسّم

مجموعۂ نگارشاتِ وکاہی

سیّد تمکین کاظمی

منشی فاضل، ایم۔اے، ایس۔بی۔ (کلکتہ) ایم۔آر۔اے۔ایس۔ (لندن)

مطبوعہ

شمس الاسلام پریس حیدرآباد دکن

سنہ ۱۹۳۱ء
۱۳۵۰ھ

طبع اوّل۔ ایک ہزار

قیمت عا دو روپیہ

ملنے کے پتے

۱ مکتبۂ ابراہیمیہ (محدود) اسٹیشن روڈ حیدرآباد دکن۔

۲ مکتبۂ جامعۂ ملیۂ اسلامیہ - قرول باغ، } دھلی

۳ مہتمم رسالہ "ساقی" کھاری باؤلی، } دھلی

۴ حسن نظامی ایسٹرن لٹریچر کمپنی لمیٹڈ، } دھلی

۵ صدیق بک ڈپو، } لکھنؤ

۶ نسیم بک ڈپو، } لکھنؤ

۷ کتابستان، ۱۷، بیلی روڈ، الہ آباد،

۸ اردو بک ڈپو، بچھراؤں (مراد آباد) یوپی،

۹ حالی بک ڈپو، پانی پت،

۱۰ شیخ مبارک علی تاجر کتب لوہاری دروازہ لاہور،



ولادت　　　مولانا شبلی مرحوم　　　وفات

طبع اول ــ ایک ہزار

قیمت عـــہ دو روپیہ

ملنے کے پتے

۱ مکتبہ ابراہیمیہ (محدود) اسٹیشن روڈ حیدرآباد دکن۔

دہلی
۲ مکتبہ جامعہ ملیہ اسلامیہ ــ قرول باغ ،
۳ مہتمم رسالہ "ساقی" کھاری باؤلی ،
۴ حسن نظامی ایسٹرن لٹریچر کمپنی لمیٹڈ ،

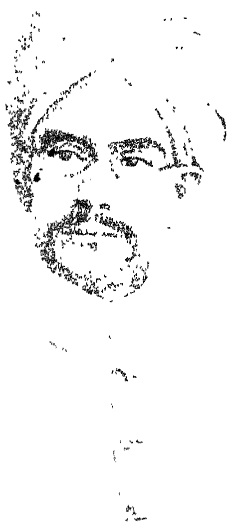
لکھنؤ
۵ صدیق بک ڈپو ،
۶ نسیم بک ڈپو ،

۷ کتابستان ۱۷ ، بیلی روڈ ، الہ آباد ،

۸ اردو بک ڈپو ، بچھراؤں (مراد آباد) یوپی ،

۹ حالی بک ڈپو ، پانی پت ،

۱۰ شیخ مبارک علی تاجر کتب لوہاری دروازہ لاہور ،



مولانا تجلّی مرحوم

ولادت
[illegible] حیدرآباد دکن

وفات
[illegible] ہجری — [illegible] شریف

بروحِ پاکِ والدِ مرحوم

مولانا تجلّی

تقدیم گردید



سید تمکین کاظمی

سرِ آغاز

بنام خداوند بخشائش گر مہرباں

ظرافیات اور مزاحیات میرے موضوع سے بہت دُور تھے کیونکہ میں اثری تاریخی اور علمی، مضامین پر زیادہ وقت صرف کیا کرتا تھا۔ ابتدا میں نے تفریحی طور پر اس قسم کے مضامین لکھنا شروع کیا چنانچہ "زن مزید" اسی سلسلہ کی پہلی قسط ہے جس کی اشاعت رسالہ نظر لکھنؤ جولائی ۱۹۲۷ء میں ہوئی مگر چند ہی مضامین لکھ کر میں نے انہیں ختم کردیا چنانچہ ۱۹۲۹ء میں سوائے ایک "گھبراہٹ" کے اور کوئی مضمون نہیں لکھا۔ مگر ۱۹۳۰ء اور اوائل ۱۹۳۱ء میں مجھے مصروف زیادہ رہنا پڑا اور مدیران رسائل نے مضامین کیلئے مارے تقاضوں کے ناک میں دم کردیا، ہر ایک رسالہ کے لئے علمی، ادبی، یا تحقیقی مضمون لکھنے کا وقت کہاں سے لاتا بعضوں کے لیے کچھ وقت نکال لیا اور بعضوں کو انہیں "بدحواسیوں" پر ٹرخا دیا۔ یہ ہے شانِ نزول ان مضامین کی جو کتابی صورت میں آپ کے سامنے ہیں، ان میں سے اکثر مضامین میرے نام سے شائع ہوئے ہیں اور بعض فرضی ناموں "نجاری" "آوازہ" "فلک نما" وغیرہ کے ساتھ چھپے ہیں۔

بعض مضامین کی زبان پر اکثر احباب کو اعتراض ہوگا کیونکہ اکثر جگہ میں نے عمداً دکنی زبان اور محاورہ استعمال کرنے کی کوشش کی ہے اور خصوصاً ان مضامین میں زیادہ کوشش کی گئی ہے جو حیدرآباد کے رسائل میں طبع ہوئے ہیں یا جن مضامین میں حیدرآباد کی تمدن و معاشرت کا نقشہ کھینچنے کی کوشش کی گئی ہے۔

خوش نصیبی سے مجھے دکنی ہونے کا فخر ہے اسی لئے میں دکنی اردو لکھتا ہوں

ترا ملک دکھن تو دکھنیچ[1] بول
تجھے کیا پرائی تو اپنیچ[2] بول

میری مادری زبان اردو ہے اور میں نے اردو کا گہرا مطالعہ کیا ہے مگر میں اس قدر مجبور ہونا پسند نہیں کرتا کہ "اماحوا" کی بجائے "ماماحوا" "گنڈیوں" کے عوض گھنڈیاں "چھاتے" کی بجائے "سینہ" "گرد ڈاڑھی" کے بدلے "گردے کی ڈاڑھی" اور "پچکے ہوئے گال" کو "پچکے ہوئے گال" کہوں۔ مجھے معلوم ہے کہ برادرانِ ہند گرد ڈاڑھی پڑھ کر گردے کی ڈاڑھی کا تصور کرنے میں تامل کریں گے اور "چھاتے" سے "سینہ" مراد نہ لیں گے مگر میں نے جان بوجھ کر ان الفاظ کا استعمال کیا ہے تاکہ وہ دکنی الفاظ جو آہستہ آہستہ غائب ہو رہے ہیں کم از کم میرے مضامین میں محفوظ رہ جائیں اور برادرانِ ہند بھی ان دکنی الفاظ سے واقف ہو جائیں۔

علاوہ ازیں بعض دکنی مصطلحات "لنگر" "جھگڑے" "تفصیر" "تنبی" وغیرہ بھی ان مضامین میں جابجا آگئے ہیں جو برادرانِ ہند کے لئے بکسر نئے ہیں بعض احباب کا

---

[1] دکھنی ہی ۱۲ [2] اپنی ہی ۱۲

خیال تھا کہ آخر میں ایک فرہنگ لگائی جائے مگر میں اس بدذوقی کا مخالف ہوں
جنھیں ضرورت ہوگی وہ کسی حیدرآبادی سے پوچھ لینگے یا مجھ سے دریافت کرلینگے۔

ان دکنی الفاظ اور مصطلحات کے بجائے میں چاہتا تو ٹھیٹھ یوپی کے محاورات
استعمال کرسکتا تھا مگر جس طرح حضرت نیاز فتحپوری نے تحریر فرمایا ہے کہ ان کی سماعت
سوا ان محاورات یا اصطلاحات کے جو گہوارے سے ان کے کانوں میں پڑے ہیں
مخالف آواز سن کر مشوش ہوتی ہے۔ اسی طرح میری زبان بھی ان محاورات اور اصطلاحات
کو ادا کرتے ہوے مشوش ہوجاتی ہے جو گہوارے سے میرے کانوں میں نہیں پڑے

چونکہ دلّی والے اپنے محاورات اور اصطلاحات بے تحاشا استعمال کیے جاتے
ہیں اور لکھنؤ والے ان پر معترض نہیں ہوتے اور لکھنؤ والے بے دھڑک اپنی زبان بولتے
اور لکھتے ہیں اور کوئی انہیں پوچھتا نہیں اسی طرح حیدرآباد والوں کو بھی اپنے حال پر
چھوڑ دینا چاہئے نہ تو دلّی والوں کو اس پر اعتراض کا حق ہے اور نہ لکھنؤ والوں کو اس مجموعہ
میں کتابت اور طباعت کی بہت سی غلطیاں رہ گئی ہیں، جب تک ہندوستان میں
لیتھو پریس رہیگا اس وقت تک یہ غلطیاں مستقل طور پر موجود رہینگی ایک میں ہی کیا سارا
ہندوستان ان چھاپے کے پتھروں سے "دق" ہے

تاہم "شمس الاسلام پریس" کے کارپردازوں کا مشکور ہوں کہ حتی الامکان رواداری
اور تندہی سے طباعت کا کام ختم کیا گیا مگر مجھے کتابت کے لئے سخت کوفت اٹھانی
پڑی کیونکہ بدقسمتی سے عبدالکریم جیسے کاتب کہاں جو زود نویس اور حیدرآباد کے اچھے کاتبوں

شمار ہوتے ہیں مگر حد درجہ غلط نویس اور بے انتہا غیر پابند نہایت کم سواد ہیں جنہوں نے املے کی غلطیوں کے علاوہ جملوں کے جملے چھوڑ دیئے اور مجھے جا بجا انہیں غلط سلط الفاظ کو الٹ پلٹ کر چھپوانا پڑا۔

"اعلام" "تاثر" "تعارف" اور "تقریب" کے لئے مکرمی مولانا نیاز فتحپوری مدیر رسالہ "نگار" لکھنؤ" محترمی مولانا احسن مارہروی لکچرار انٹرمیڈیٹ کالج علیگڈھ" محبی حضرت ملا رموزی (بھوپال) اور عزیزی مولوی عبدالمنعم سعیدی (گلبرگہ) کا رہین منت ہوں کہ باوجود اپنی مصروفیتوں کے ان حضرات نے "غنچۂ تبسم" کے لئے کچھ نہ کچھ لکھا۔

"صحت نامہ" کی ترتیب کے لئے محترمی مولوی محمد سردار علی صاحب مدیر رسالہ "تجلی" کا مشکور ہوں کہ آپ نے صحت نامہ مرتب فرما دیا اگر ان غلطیوں کے علاوہ اور کچھ غلطیاں رہ گئی ہوں تو اسے مولوی صاحب کی بشریت پر محمول فرمائیے۔

والد مرحوم کی اور اپنی تصویر کے بلاک کے لئے برادر مکرم مولوی شاہد احمد بی اے (آنرز) مدیر رسالہ "ساقی" دہلی کا ممنت پذیر ہوں کہ موصوف نے خاص طور پر دونوں بلاک بنوا کر روانہ فرمائے۔

مشفقی مولوی عبدالحق صاحب مہتمم مکتبۂ ابراہیمیہ (محدود) حیدرآباد دکن کا شکریہ ادا کرنا اس لئے ضروری ہے کہ انہیں کی وجہ اس مجموعے کی ترتیب کا خیال پیدا ہوا اور انہوں نے ہی مجبور کر کے اس کی طباعت کے لئے آمادہ کیا فقط

تمکین کاظمی

ملک پیٹھ - حیدرآباد دکن
۱۔ جون ۱۹۳۱ء

اعلام

از

مولانا نیاز فتحپوری مدیر رسالہ نگار (لکھنؤ)

غنچۂ تبسّم جناب تمکین کاظمی کے اُن مضامین کا مجموعہ ہے جو
"فکاہات" کے سلسلہ میں انہوں نے لکھے ہیں۔ چونکہ میں "طنزیات"
اور "مزاحیات" دونوں کو "فکاہات" میں شامل کرتا ہوں، اسلئے
میرا مقصود یہ ہے کہ دو رنگ کے مضامین اس مجموعہ میں نظر آتے ہیں۔
اس وقت یورپ کا کوئی شعبۂ علم ایسا نہیں ہے جس میں ظریفانہ
طرزِ تحریر مقبول نہ ہو خصوصیت کے ساتھ تنقید کہ اسکی تکمیل ہو ہی
نہیں ہو سکتی جب تک اس میں ظرافت کا گہرا رنگ شامل نہ ہو۔ ہندوستان
میں اس انداز کے لکھنے والے چند ہیں۔ جناب تمکین کاظمی نے حال
ہی میں اس رنگ کو اختیار کیا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ التفات
ابھی ہوا ہے کہ وہ اس صنفِ ادب پر ابھی لکھنے کی قابلیت
رکھتے ہیں۔

اس مجموعہ کے تمام مضامین صحیح معنی میں "تنقید نگاہی" کی حیثیت رکھتے ہیں اور چونکہ وہ یکسر مقامی حالات مقامی تشخصات یا حیدرآباد کی اصطلاح میں "ملکی" افراد و مناظر سے متعلق ہیں اس لئے انکا پورا لطف اٹھانا کسی غیر شخص کیلئے دشوار ہے۔ تاہم اس سے انکار نہیں ہوسکتا کہ اگر اس خصوصیت سے قطع نظر کرنے کے بعد بھی انکو دیکھا جائے تو ان کے پڑھنے اور ختم کرنے پر بڑی حد تک انسان مجبور ہوجاتا ہے خواہ وہ واقعات و تلمیحات سے بیگانہ ہی کیوں نہ ہو۔ میں صحیح فیصلہ نہیں کرسکتا کہ موجودہ حیدرآباد "دورِ نہضت و ارتقاء" سے گذر رہا ہے یا "دورِ انحطاط" سے لیکن ان مضامین کے دیکھنے کے بعد میں یہ ضرور کہہ سکتا ہوں کہ وہ ضرور کسی ایسے زمانہ سے گزر رہا ہے جو پہلے سے مختلف اور بہت مختلف ہے۔ جناب تمکین کاظمی کے اکثر مضامین اسی حقیقت کے مطالعہ کا نتیجہ معلوم ہوتے ہیں اور میں نہیں سمجھ سکتا کہ نتیجہ کے لحاظ سے وہ حیدرآباد حالیہ کو ترجیح دیتے ہیں یا دور ماضی کے سوگواروں میں ہیں وکنا ہی مضامین کی سب سے بڑی خوبی محاکات اور تجزیۂ جذبات کہلاتی ہے۔ سو ان دونوں کی اچھی اچھی مثالیں اس مجموعہ میں نظر آتی ہیں۔

زبان کے لحاظ سے البتہ مجھے اکثر جگہ اختلاف ہے لیکن ظاہر ہے کہ

یہ اختلاف شمال و جنوب کا اختلاف ہے جس کا دور ہونا ممکن نہیں
اور نہ اس پر زیادہ اعتناء کی ضرورت ہے۔ اکبر مرحوم کی ایک صحبت میں
زبان و صحت زبان کا ذکر تھا انہوں نے کیا خوب بات کہی کہ اگر کوئی
بنگالی "ہاتھی آئی" کہتا ہے تو ہنسنے کی ضرورت نہیں، یہ دیکھو کہ اسکا
مدعا تمہاری سمجھ میں آگیا یا نہیں۔ کیونکہ زبان کا مقصود یہی ہے۔ میں
بڑی حد تک اس کا موافق ہوں لیکن اس کا کیا علاج کہ جو محاورے
یا اصطلاحات گھوارہ سے کانوں میں پڑے ہیں۔ انکے خلاف اگر کوئی
آواز آجاتی ہے تو تھوڑی دیر کیلئے سماعت مشوّش ہو جاتی ہے۔

مجھے مسرت ہے کہ میرے قیام حیدرآباد کے دوران میں اس
مجموعہ کے کچھ اجزاء جناب تمکین کاظمی نے مجھے مطالعہ کیلئے مرحمت
فرمائے اور ان کے ارشاد کی تعمیل میں مجھے اس خیال کے اظہار
کا موقع ملا۔ فقط

حیدرآباد دکن
۱۴۔ اپریل ۱۹۳۱ء

نیاز فتحپوری

اس مجموعہ کے تمام مضامین صحیح معنی میں "تنقید وکناہی" کی حیثیت رکھتے ہیں اور چونکہ وہ یکسر مقامی حالات مقامی تشخصات یا حیدرآباد کی اصطلاح میں "ملکی" افراد و مناظر سے متعلق ہیں اس لئے انکا پورا لطف اٹھانا کسی غیر شخص کیلئے دشوار ہے۔ تاہم اس سے انکار نہیں ہوسکتا کہ اگر اس خصوصیت سے قطع نظر کرنے کے بعد بھی انکو دیکھا جائے تو ان کے پڑھنے اور ختم کرنے پر بڑی حد تک انسان مجبور ہو جاتا ہے خواہ وہ واقعات و تلمیحات سے بیگانہ ہی کیوں نہ ہو۔ میں صحیح فیصلہ نہیں کرسکتا کہ موجودہ حیدرآباد "دورِ ہفت دار تقاء" سے گذر رہا ہے یا "دورِ انحطاط" سے لیکن ان مضامین کے دیکھنے کے بعد میں یہ ضرور کہہ سکتا ہوں کہ وہ ضرور کسی ایسے زمانہ سے گزر رہا ہے جو پہلے سے مختلف اور بہت مختلف ہے۔ جناب تمکین کاظمی کے اکثر مضامین اسی حقیقت کے مطالعہ کا نتیجہ معلوم ہوتے ہیں اور میں نہیں سمجھ سکتا کہ نتیجہ کے لحاظ سے وہ حیدرآباد حالیہ کو ترجیح دیتے ہیں یا دورِ ماضی کے سوگواروں میں ہیں۔ وکناہی مضامین کی سب سے بڑی خوبی محاکات اور تجزیہ جذبات کہلاتی ہے۔ سوان دونوں کی اچھی اچھی مثالیں اس مجموعہ میں نظر آتی ہیں۔

زبان کے لحاظ سے البتہ مجھے اکثر جگہ اختلاف ہے لیکن ظاہر ہے کہ

یہ اختلاف شمال وجنوب کا اختلاف ہے جس کا دور ہونا ممکن نہیں اور نہ اس پر زیادہ اعتناء کی ضرورت ہے۔ اکبر مرحوم کی ایک صحبت میں زبان وصحت زبان کا ذکر تھا انہوں نے کیا خوب بات کہی کہ اگر کوئی بنگالی "ہاتھی آئی" کہتا ہے تو ہنسنے کی ضرورت نہیں، یہ دیکھو کہ اسکا مدعا تمہاری سمجھ میں آگیا یا نہیں۔ کیونکہ زبان کا مقصود یہی ہے۔ میں بڑی حد تک اس کا موافق ہوں لیکن اس کا کیا علاج کہ جو محاورے یا اصطلاحات گہوارہ سے کانوں میں پڑے ہیں۔ انکے خلاف اگر کوئی آواز آجاتی ہے تو تھوڑی دیر کیلئے سماعت مُتوحش ہو جاتی ہے۔

مجھے مسرت ہے کہ میرے قیام حیدرآباد کے دوران میں اس مجموعہ کے کچھ اجزاء جناب تمکین کاظمی نے مجھے مطالعہ کیلئے مرحمت فرمائے اور ان کے ارشاد کی تعمیل میں مجھے اس خیال کے اظہار کا موقع ملا۔ فقط

حیدرآباد دکن
۱۴۔ اپریل ۱۹۳۱ء

نیاز فتحپوری

تاشُّ

از

مولانا احسن مارہروی پروفیسر ادبیات اردو مسلم یونیورسٹی علیگڈھ

کہنے کو ہمارے منہ میں زباں ایک ہی، مگر بولتے وقت لب و دہن کی مختلف حرکات کی وجہ سے اس یکرنگ کی نیرنگیاں عجیب عجیب انداز دکھاتی ہیں۔ آپ کسی ایک لفظ کو لے لیجئے اور بولتے وقت اسی ایک لفظ کا لب و لہجہ بدلتے جائیے، پھر دیکھیئے کہ ایک لفظ اپنے ہر رد و بدل میں کیا کیا مفہوم پیدا کرتا ہے۔ مثلاً ایک لفظ چُپ بمعنی خاموشی یا خاموش عام بول چال میں ہے۔ اب اس کے مفہوموں کی تعداد گنئے۔

(۱) تحکمانہ لہجے میں (بصیغۂ امر)

(۲) پیار کے انداز میں (آواز نرم)

(۳) رازداری کا پہلو لئے ہوئے (آہستہ سے)

(۴) حیدرآبادی مفہوم میں بمعنی گزراں (ٹھیٹھین)

ان مطالب کے سوا اور معنوی پہلو بھی اس لفظ میں حسب موقع نظر آتے ہیں جنکی تفصیل غیر ضروری سمجھی گئی۔ عام اردو جاننے والے خود سمجھ لیں گے۔ غرض یہ ہے کہ ہر زبان اپنے مراتب تربیت میں مختلف نوعیتیں رکھتی ہے اور اسکی تدریجی حالت عام تصنیف و تالیف، سیاسی لکچر، مذہبی مواعظ اور روزمرہ بات چیت میں ایک دوسرے سے جداگانہ نظر آتی ہے۔ ان سب تنوعات کے بعد تقریر و تحریر کی متانت و ظرافت ایک نوعیت خاص ظاہر کرتی ہے جو ہر ادبی زبان میں تفنن طبع کیلئے ضروری اور جزو لاینفک ہے۔

اسالیب بیان کے یہ تغیرات فطری اور وہبی ہیں ان سے اختلاف کرنا گویا قدرت سے روگرداں ہونا ہے۔ جس طرح تلفظ کے انداز و ادا میں اختلاف ہے۔ اس طرح ہر متین اور ظریف مضمونکے بھی مراتب مدارج مختلف ہوا کرتے ہیں۔ خشک بیانی بے کیف سخن آرائی نامربوط اور اجنبی زبان سنجیدہ مضامین کیلئے غیر دلچسپ ہے اور فحش یا عریاں مذاق بذلہ سنجی کے منافی۔ ہر مقرر و محرر کا فرض اولین ہے کہ جس بحث پر تقریر یا تحریر کی جائے ان خصوصیات کا لحاظ رکھا جائے جن سے ادب عالیہ کی توقیر ہوتی ہو نہ کہ توہین۔

غنچۂ تبسم جسکا نام ہمارا ہے کہ یہ غنیۃ المصلی یا ازالتہ الاوھام

جیسی کتابوں میں شامل نہیں ہے بلکہ تفنّنِ طبع اور انشراحِ قلب کی
دلچسپیاں بڑھانے کے لئے تالیف کیگئی ہے اس کا مذاق بیہودگی
اس کا اندازِ بیان بدتمیزی سے وست و گریباں نہیں بلکہ الهزل فی الکلام
کالملح فی الطعام کا مصداق ہے جس کے مصنف جناب تمکین کاظمی
ہیں۔ اپنی نسبتِ اسمی کے لحاظ سے تو ان عزیز کو جبل ابو قبیس یا کم
از کم اپنے ملک کے الیورا غاروں[1] کی بابت کوئی مستحکم اور منجمد کتاب
لکھنی چاہئے تھی تاکہ انکی تمکنت مسلم الثبوت ہو جاتی لیکن اس طرح
عمل پیرا ہونے میں انہیں اپنی ایک خلقی اور پیدائشی خصلت سے اعراض
کر کے کفرانِ نعمت کا الزام اپنے سر لینا پڑتا۔

بہر حال میں نہایت مسرت سے انکی بذلہ سنجیوں کی داد دیتا ہوں
اور دعا کرتا ہوں کہ انکی نثر کو بھی لسان العصر اکبر مرحوم کی نظم کے
برابر مقبولیت نصیب ہو۔

ہندوستان کے اکثر کثیر الاشاعت جرائد و رسائل میں اب تک
ان کے جو مزاحیہ مضامین شائع ہوتے رہے ہیں ان سب کو یکجا

---

[1] حضرت! چند روز انتظار فرمایئے۔ ”غارہائے الیورا“ سے متعلق ایک
کتاب تیار ہے جو عنقریب طبع ہوگی (تمکین)

کر دیا گیا ہے جن کی مختصر مگر جامع تعریف یہ ہے کہ ؎

ہے غنچۂ تبسمِ تمکینِ کاظمی
ایسا مذاق جس میں متانت ہے لازمی

احسن مارہروی

انٹرمیڈیٹ کالج مسلم یونیورسٹی علیگڈھ

۱۲ اپریل سنہ ۱۹۳۱ء

تعارُف

از

ضیاء الملک حضرت مُلّا رموزی، فاضل الٰہیات، ایم آر، اے، ایس ئ (لنڈن)
یم، ال، ایس ئ (امریکہ)

اگر کنوئیں کے برابر گہری اور تالاب کے برابر چوڑی نظر سے دیکھا جائے تو زبان اُردو اور ادبیات اردو کیلئے یہ زمانہ وہ اللہ بخشی میر امّن دہلوی اور میر انیس لکھنوی کے زمانہ سے اسلئے کہیں اچھا ہے کہ اس زمانہ میں لکھائی چھپائی اور "لادنے" اور "لیجانے" کے ذرائع کافی ہیں اور انہی چیزوں سے روپیہ کمانے کی خاطر چند تجارت پیشہ لوگوں نے اردو میں جو رنگین اور چمکدار اور اونچے پورے اخبارات اور رسالے جاری کئے تو نام یہ ہوا کہ "اردو خاصی ترقی کر چکی" حالانکہ اونچی نظر والوں کا خیال ہے یعنی ملا رموزی کا کہ اگر اردو واقعی معنی میں کوئی ٹھوس ترقی کرتی تو سب سے پہلے وہ اپنے پرانے مولوی عبدالحق صاحب کی عزت افزائی کا بت اورنگ آباد میں کبھی کا نصب کر دیا جاتا اسلئے کہ جہاں اب مولوی صاحب ممدوح کے نام کے ساتھ لفظ "انجمن ترقی

اردو" تخلص سا بن کر رہ گیا ہے۔ وہاں بھی ایک مولوی صاحب تھے
جنہوں نے بی اے پاس کرکے بھی "ترقی اردو" کی زبردست خدمات
انجام دیں مگر نتیجہ یہ نکلا کہ ایک ہزار روپیہ ماہوار پر "الٹے" ملازم تو رکھ
لئے گئے مگر خدمت ادب و زبان کیلئے آزاد نہ کئے گئے۔ اور مناصب
یا جاگیریں پا رہے ہیں وہ جو پانیر اخبار کے سوا یہ بھی نہیں جانتے کہ ہمارے
والد کی زبان اردو تھی یا انگریزی؟

القصہ جو کچھ بھی ہوا، ہوا لیکن ملا رموزی کی پسند کی دو چار باتوں
میں سے ایک یہ بات بہت ہی عمدہ ہوئی کہ اس زمانے میں دو چار
اہل قلم نہایت ہی بہتر پیدا ہو گئے جن میں سے باقی کے نام دل میں
رکھ کر صرف حیدرآباد کے بنے ہوئے مولوی تمکین کاظمی صاحب
منشی فاضل، ایم، آر، اے، ایس، کا نام ظاہر کرتے ہیں پس واضح ہو کہ
ہمیں اس سے کوئی بحث نہیں کہ تمکین صاحب کے اندر مہمان نوازی[1]
کی صلاحیت ہے یا نہیں یا وہ دس بارہ میل پیدل بھی چل سکتے ہیں[2]
یا نہیں وہ شیروانی[3] کیوں پہنتے ہیں اور کوٹ سے کیوں نفرت ہے؟

---

[1] قطعاً صلاحیت نہیں ہے ورنہ ضرور آپ کو حیدرآباد بلاتا [2] بحمد اللہ دس بارہ کیا بیس پچیس میل چل سکتا ہوں [3] بفضلہ کوٹ پتلون سے نفرت قطعاً نہیں کبھی کبھی اسے بھی پہنتا ہوں (تمکین)

وہ موزے پاجامے کے اُوپر چڑھا کر پہنتے ہیں[۱] یا اندر۔ وہ قمیص کے اوپر والا بٹن کھلا ہوا رکھتے ہیں[۲] یا بند۔ وہ بازار سے سودا سلف خود لاتے ہیں[۳] یا اُن کا ملازم؟ اگر سودا خود ہی لاتے ہیں تو وہ دکاندار سے بے قیل و قال سودا خرید لیتے ہیں یا کچھ دیر اس سے یہ بھی کہتے ہیں[۴] کہ

ابے مجھے دیتا ہے کہ نہیں؟

ابے اُلّو چلّا تو رہا ہوں کہ ڈھائی آنے کی دیدے ڈھائی آنے کی

بس تو لا دھر دے میرے دام مجھے نہیں لینا تجھ سے!

ہاں ہاں بس ایک تو ہی تو لال سوداگر رہ گیا ہے حیدرآباد میں!

بلکہ ہمیں تو اس سے بحث ہے کہ مولوی تمکین صاحب مضمون نگار ہیں تو کیسے؟ اور اُن کے مضامین زبانِ اردو کیلئے کس حد تک مفید و موثر ہیں۔

ان دونوں سوالات کو اگر مولوی سلیمان ندویوں[۵] ابوالکلام

---

[۱] ایسی بدذوقی آج تک نہیں کی۔

[۲] صرف شدید گرمیوں اور محرم میں [۳] افسوس ہے کہ یہ آج تک نہ آیا۔

[۴] شکر ہے کہ ایسا موقعہ کبھی نہیں ہوا صرف کتب فروشوں سے کبھی کبھار جھڑپ ہوگئی ہے وہ بھی مکتبہ والوں یا احمد حسین جعفر علی کی دوکاں والوں سے (تمکین!)

آزادوں" کی قسم کے لوگوں کو دیدیجئے تو استغفر اللہ وہ منطقی ترکیب وتحلیل وتنقید فرمائیں گے کہ دماغ کے دو تین طبق الٹ جائیں گے مگر کچھ سمجھ میں نہ آئیگا۔ اسلئے ہم تو ایک نہایت۔ غریب مضمون نگار کی حیثیت سے ان سوالات کو حل کرتے ہیں۔ چنانچہ مولوی تمکین صاحب کی تحریروں کے وزن اون کے وقار انکی علمیت انکی ترتیب انکی ادبیت اور انکی تاثیری حیثیت سے پہلے خدا جانے کیا بات ہے جو ہمارا دل اپنی ہی مضمون نگاری کی تعریف کرنے کو چاہتا ہے۔

چنانچہ صاف عرض کرتے ہیں کہ ماشاءاللہ ہم اب چودہ پندرہ برس کی عمر کے مضمون نگار ہو چکے ہیں اسلئے اتنی بڑی عمر[1] میں ہم کو اس معاملہ میں جو پہلا تجربہ ہوا وہ یہ ہے کہ مضمون نگاروں میں یہ عادت ضرور ہوتی ہے کہ وہ اپنے سے بہتر اور اپنے سے زیادہ مقبول و مشہور مضمون نگار کی کبھی تعریف نہیں کرتے بس اگر بہت ہی زیادہ انصاف پسند بنے تو مرے ہوئے شاعروں اور مضمون نگاروں کی تعریف میں ایک آدھ مضمون لکھدیا۔ یا کسی محفل میں مجبور ہو کر اتنا کہدیا تو بہت کہدیا کہ "ہاں میں مانتا ہوں کہ ملا رموزی اور تمکین کاظمی اچھا لکھنے والوں میں ہیں" اور بس لیکن اگر کوئی ان سے لکھدے کہ آپ خود اپنی مضمون نگاری کی تعریف میرے نام سے لکھدیجئے میں کسی سے یہ ظاہر نہ کروں گا تو

[1] یہ بھی عجیب لطیفہ ہے کہ ملا صاحب کی عمر اور میری عمر اور مضمون نگاری کی مدت تقریباً برابر برابر ہیں صرف چند مہینوں کا فرق ہے۔ (تمکین)

پھر دیکھئے کہ جس رائے کو انہوں نے ملا رموزی اور تمکین کاظمی کے لئے
معمولی الفاظ میں ظاہر کیا ہے اسی رائے کو اپنے لئے لکھتے وقت ایسے
شاندار الفاظ میں لکھیں گے کہ دنیا اُن کے رتبۂ عالی کی قائل ہو کر رہ جائے
لہٰذا اس عادت کے موافق "عجب ملا رموزی بقلم خود" کی یہی عادت ہے کہ
نہ کسی مضمون نگار کے مضمون کو کبھی پڑھنا نہ کبھی انکی تعریف کرنا۔ مگر
اسی عادت سے ایک یہ قانون بھی بن جاتا ہے کہ جو مضمون نگار کبھی
کسی دوسرے مضمون نگار کی تعریف نہیں کرتا اگر وہ کبھی کسی مضمون نگار کی
تعریف کرتا ہوا دیکھ لیا جائے ....
یا پہچان لیا جائے یا بھانپ لیا جائے یا تاڑ لیا جائے یا پکڑ لیا جائے
یا سُن لیا جائے یا سمجھ لیا جائے یا جان لیا جائے یا مان لیا جائے تو
پھر یقین فرمالیجئے کہ ایسے ہی مضمون نگار کی تعریف اصل اور صحیح
تعریف ہو گی۔

لہٰذا ہم "رُوبقبلہ" ہو کر کہتے ہیں کہ ہم جو مولوی تمکین کاظمی کی مضمون
نگاری کے قائل ہوئے تو اس لئے کہ انہیں جب دیکھا یہی کہ "بس لکھ
رہے ہیں" اور "چھپوا رہے ہیں" یعنے اُنکی "کثرتِ نگارش" اور "حوصلۂ
عمل" اور اسی لئے تو ہم کسی ایسے مضمون نگار کے سلام کا جواب تک
دینا پسند نہیں کرتے جو بڑے "طمطراق" اور "دبدبے" سے سال

ڈیڑھ سال تک برابر لکھتے رہے اور پھر کہیں ملازم ہوئے تو افسر صاحب کو سلام کرتے کرتے وہ اپنی تمام مضمون نگاری بھی بھول گئے اور شاعری بھی اب کبھی کبھی دوستوں کے کہے بغیر کوئی دقیانوسی مضمون اٹھا لائے اور یہ کہکر بیٹھے سنا رہے ہیں کہ دیکھئے ملا رموزی صاحب میں بھی کبھی "اودھ پنچ" میں مضمون نگاری کرتا تھا مگر کیا کہوں جناب کہ اس ملازمت نے کہیں کا نہ رکھا، اسلئے اب تو واللہ نہ کبھی اخبار پڑھنے کو ملتا ہے نہ کوئی رسالہ دیکھنے میں آتا ہے۔

سبحان اللہ کیا دلیل ہے آپکی اور کیا فخر فرما رہے ہیں آپ سال ڈیڑھ سال کی مضمون نگاری پر[1]، ارے بھئی آپ کے ہاتھ کسنے جوڑے تھے کہ آپ مضمون نگاری فرمائیں جبکہ آپ مالی مصائب کا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے اور قدرت کے کارخانہ میں آپ "منشی جی" اور دفتری آدمی کہے جانے کے لئے ڈھالے گئے تھے۔

مگر تمکین کاظمی کہ یہ "اللہ کے بے حد لکھنے والے بندے" جب سے مضمون نگار بنے ہیں استغفر اللہ جو کبھی جمعہ کے دن بھی مضمون لکھنا ترک کیا ہو تو اس کثرتِ نگارش سے آپ کے نزدیک تمکین صاحب کی بہادری ثابت ہو گی اور ارباب علم و فضل کے نزدیک انکی

[1] کیا فرماتے ہیں مولوی عبدالمنعم صاحب سعیدی ملا صاحب کے اس حسنِ ظن کے متعلق؟ (تمکین)

عالمانہ اور انشا پردازانہ فضیلت، کیونکہ جس شخص کے پاس علم و ادب
اور حکمت و خطاب کا جتنا زیادہ ذخیرہ ہوتا ہے وہ اتنا ہی زیادہ
لکھنے والا بن جاتا ہے اور جو یقین نہ ہو تو ذرا آپ اپنے ہاں کے
"کوتوال صاحب" سے اتنے مضامین لکھوا لیجئے جتنے کہ تمکین صاحب
لکھ چکے ہیں اور لکھتے چلے جا رہے ہیں۔ کیونکہ وہ مضمون نگاری نہیں
ہے کہ سال بھر میں چار مضمون لکھ دیئے اور پھر ایک سال کے بعد ہی
ملازمت میں یوں جذب ہو گئے کہ پھر نہ ہمیں اور نہ آپ کو ملیں اور
نہ سی۔ آئی۔ ڈی۔ کو!

مجھے یہاں تمکین صاحب کی عام مضمون نگاری اُن کے مضامین
کی محققانہ بلند نظری، عالمانہ پختگی اور ترتیب و تاثیرِ بیاں سے بحث
نہیں جبکہ یہ تمام کمالات انشاء اُنکی تحریریں موجود ہیں مجھے تو یہاں
اُنکی لطافت نگاری سے بحث ہے۔ پس واضح ہو کہ اسوقت جب کہ
ملا رموزی نے لطافت نگاری اور ظریف تحریروں کو انشاء اردو کا
ضروری حصہ قرار دینے کی کوشش کا آغاز کیا اسوقت اردو میں تین چار
آدمی ایسے تھے جو عید بقر عید پر ایک آدھ ظریف مضمون لکھ دیتے تھے
اور اردو میں لطافت نگاری کی یہی وہ "قحط سالی" تھی جس کے باعث
اس قسم کے "کبھی کبھی نگار" بھی حد سے سوا مشہور ہو گئے۔ ورنہ اہلِ

اپنے ان چند اور بہت ہی کم چند مضامین کے ذریعہ اتنا مشہور ہونا چاہیئے
تھا۔ البتہ ملا رموزی کے بعد برادرم مولانا سالک بی اے، ایڈیٹر
اخبار "انقلاب لاہور" نے ظرافت نگاری میں جس استقلال اور کثرتِ
نگارش کا ثبوت دیا وہ قابل تذکرہ ہے۔ ممدوح کے بعد ایسے
نوجوان لطافت نگار بھی پیدا ہوئے جنہوں نے چند دن تو ملا رموزی
اور سالک کے "پاؤں پر پاؤں رکھے" مگر سال ڈیڑھ سال کے بعد یہ بھی ایسے
ٹھنڈے ہوئے کہ آج نہ انکا رسالوں میں پتہ ملتا ہے اور نہ اخبارات کی ہمت
آزما دنیا میں کیونکہ انہوں نے اخباروں میں کبھی قدم ہی نہیں رکھا تھا تو واضح ہو کہ ایسے
چند روزہ لطافت نگاروں کی تحریر سے نہ زبان اردو کو کوئی فائدہ نہ انکے مخاطب حضرات کو کوئی لطف۔

اب اس کے بعد سوال یہ ہے کہ ظرافت کی صحیح تعریف کیا ہے
اور صحیح معنی میں ظریف کسے کہہ سکتے ہیں، سو اس کیلئے یہ "علی گڈھ
قسم کے لوگ" تو یورپ والوں کی لکھی ہوئی تعریفات کا ترجمہ پیش
کرکے بہت خوش ہوتے ہیں کہ ہم نے جو تعریف پیش کی ہے بس وہ
دنیا میں سب سے آخری تعریف ہے اور "دیوبند قسم کے لوگ"
جب "اما بعد" لکھکر تعریف فرماتے ہیں تو یوں سمجھ لیجئے کہ گویا
کسی لغت کی کتاب کو نثر کر دیا ہے، مرجائیے مگر سمجھ میں ایک جملہ
بھی نہ آئے۔ رہے اپنے ملا رموزی صاحب سو یہ بیچارے ایسے

آدمی ہیں کہ یہ نہ انگریزی سے دلیل پیش کریں نہ عربی سے بس نہیں
تو وقت پر جو سوجھ جائے اور جو سمجھ میں آجائے اس لئے اسوقت
انکی سمجھ میں ظرافت کی تعریف یہ آئی کہ

"ظریف تحریر وہ جو پڑھنے والے کو اس موقع پر ہنسا دے"
"جہاں ہنسنے کے لئے اس کا دل نہ چاہتا ہو اور ظریف"
"وہ جو حد سے سوا ہنسی پیدا کرنے والی تحریر لکھتا چلا جائے"
"اور یہ نہ سمجھے کہ میں ظریف تحریر لکھ رہا ہوں"

بس یہی کمال ہے مولوی تمکین کاظمی کی تحریر میں اونکی لطافت
کا۔ اب رہا یہ سوال کہ آخر تمکین صاحب ظریف ہیں بھی یا نہیں
اور اگر ہیں تو کب سے ہوئے؟ کس طرح ہوئے؟ کیوں ہوئے
کس لئے ہوئے؟ کس واسطے ہوئے؟ کس کے ورغلانے سے ہوئے
اور اب جو بن چکے ہیں تو بنے ہی رہیں گے یا نہیں؟ سو آخری سوال
جواب تو یہ ہے کہ وہ تو بنے رہینگے۔ مگر انکی مخاطب جماعت کبھی
انکی قدر نہ پہچانے گی نہ انکی کتابوں کو خریدے گی نہ انکے مضامین
معاوضہ دیگی نہ انہیں اردو کی یہ اورنگ آباد سے لیکر پنجاب تک
کی ایک انجمن کوئی خطاب دیگی نہ کسی حکومت سے انہیں منصب علمی
ملے گا!

غرض یہ ہے کہ جب قوم اور مخاطب جماعت کی ناقدردانی اور حوصلہ شکنی کا یہ عالم رہیگا تو ایک تمکین کاظمی کیا اگر ہزار تمکین کاظمی ہونگے تو چار وناچار مضمون نگاری کو چھوڑ کے میں ڈالکر کسی دفتر میں ملازمت کر لینگے[1] "مجھ ملا رموزی قوم مسلمان ساکن ہندوستان" کے خیال میں تمکین ایک ایسے ذی حوصلہ اور بلند مرتبہ صاحب قلم ہیں جو محض اپنے ثبات عمل اپنے بلند پایہ مضامین کے باعث دنیائے علم و ادب میں تمکین کاظمی بنے ہیں۔

تمکین کے مضامین میں جو ظرافت ملتی ہے اگر سچ پوچھئے اور سچ لکھوائے تو ملا رموزی اسے ظرافت نہیں بلکہ "دریائے لطافت" اسلئے کہتا ہے کہ ظرافت تو وہ ہوتی ہے کہ پڑھے اور مارے ہنسی کے چارپائی پر گر جائے یا دیوار سے ٹک جائے یا پیٹ پکڑ کر بیٹھ جائے اور لطافت وہ کہ پڑھئے اور ایک ہلکے سے سرور کے ساتھ مست ہوجائیے اسلئے انکی تحریروں میں غالب حصہ متانت اور کارآمد باتوں کا ہے اور بہت کم حصہ مذاق و تفریح کا مگر جس کم حصے میں انھوں نے ظرافت سے کام لیا ہے حق یہ ہے کہ وہ ظرافت اپنی اصولی بلندپایگی

---

[1] جی حضرت ہی کر رہے ہیں (تمکین)

اور تاثیر کے اعتبار سے نہایت درجہ قابل قدر اور دماغ میں وُجد
وکیف کی امنگیں پیدا کرنے والی ہوتی ہے اور سچ تو یہ ہے کہ "میں
ملّا رموزی ملازم سرکار بہ تنخواہ قلیل" جب تمکین کی لطیف تحریروں کو
پڑھ کر مسکراتا ہوں ہنستا ہوں اور قہقہے لگاتا ہوں تو پھر کون ہے جو
انکی روح پرور تحریروں سے بے خود نہ ہو جائے گا؟ کیونکہ میں اس
قسم کا ملا رموزی واقع ہوا ہوں کہ ہر وقت اپنے چہرے کو افسروں کی
طرح "دبدبہ انگیز" بنائے رہتا ہوں، لوگوں سے بہت کم بات
کرتا ہوں، بات بات پر لڑنے کو تیار مگر مرنے کو "ناتیار" اور تو اور
مزاجی غرور یہ ہے کہ اپنے ہر مضمون میں اپنی تعریف خود لکھتا ہوں اور
ذرا نہیں شرماتا اس لئے میری اس خود ستائی پر میرے عیوض وہ
بیچارے کوئی ڈھائی فٹ کے "سہاشاعر" شرماتے رہتے ہیں اور
تاؤ کھاتے رہتے ہیں تو پھر ایسا شخص جب تمکین کی تحریروں کو
اس بے خودی کے ساتھ پڑھے کہ "وہ" بھی دالان میں سے
ہنس کر کہیں کہ "بس سمجھ گئے ہم وہی حیدرآباد والوں کا مضمون پڑھ
رہے ہونگے آپ" گویا ہمارا کسی کتاب یا کسی رسالے کو پڑھ کر ہنسنا
ہمارے ننھے میاں کی والدہ کے نزدیک صرف اسی وقت یقینی ہے
جب کہ ہم تمکین صاحب کا کوئی مضمون پڑھیں۔ پھر جس مضمون کی

لطافت اور ظرافت کو شوہر کے ساتھ اسکی بیوی تک مان لے تو پھر سمجھ میں نہیں آتا کہ تمکین کی لطافتِ نگارش سے انکار کرکے کون ہوگا جو خود کو کافر قرار دیگا؟[1]

تمکین صاحب کے ذیل کے مضامین "مرزا صاحب" "میر صاحب" "منشی جی" "بوکھلاہٹ" "جھٹکا" "عطردان" وغیرہ اوپر والی تعریف کے موافق اور نمونے ہیں۔ ان مضامین میں علاوہ دل نواز لطافت کے خاص سے بھی زیادہ اونچی خاص بات ان کے بیانکی سلاست ہے۔ اور بیان و مضمون کی آسان عبارت اور ترکیب ہی ایک ایسی صنعت ہے جو فن انشاء کا حسین ترجز ہے لہذا اس حساب سے میں تمکین صاحب کے مضامین کو بلند اور چوٹی کے مضامین کہنے کو تیار ہوں۔ انکی تحریر کا دوسرا حسن زبان اور محاورے کا اہتمام ہے اور اگر اس معاملہ میں لکھنؤ والوں کی طرح زیر، زبر اور پیش کے سہو کو کمزوری اور "نالیاقتی" نہ کہا جائے تو میں کہتا ہوں کہ تمکین کی تحریریں ہر طرح اردو کی جان ہیں اور مال بھی۔ ان کی تحریر کا تیسرا حسن یہ ہے کہ وہ جس عنوان پر لکھتے ہیں

---

[1] لیجیے اب ملا صاحب کفر کے فتوے بھی دینے لگے اللہ کرے "تہانہ ہوتی" زنگ دربادہ ہو (تمکین)

اس میں وسعت نظر، تحقیق اور جزئیات کا بڑا مکمل ذخیرہ موجود ملتا ہے
پھر ان خوبیوں کے بعد اگر آپ چاہیں کہ وہ کفر کے فتوے بھی لکھیں۔
تب مضمون نگار مانیں تو یہ آپ کا ذوق، ورنہ مضمون نگاری کے اصول
سے کچھ شک نہیں کہ اونکے مذکورۂ بالا مضامین وہ ہیں جن کے پڑھنے
سے دل ودماغ اور روح کو "حیاۃ آرا جوش" "خوشی" "مستی" اور
"بیداری" نصیب ہوتی ہے۔

پھر اگر آپ شوہر ہو کر اپنی بیوی کو مسرت و زندہ دلی کی دولت سے
شاد کام بنانا چاہتے ہیں تو اُن کے ان مضامین کو حاصل کرکے دوزخ
کی آگ[1] سے محفوظ ہو جائے۔ کیوں کہ مان لیجئے کہ جو شخص تمکین کاظمی کے
ان بہار افروز و عالم آرا مضامین کو نہ پڑھیگا خدا ہی ہے جو وہ دوزخ
سے محفوظ رہے

اور ہاں انکی تحریر کا چوتھا حسن یہ ہے کہ وہ دن کی روشنی سے
محروم ہیں یعنی "ملازمت پیشہ اور قوم سید ہیں"۔ مگر اس قید و بند پر
وہ اس درجہ دلکش تحریر سے زبان اردو میں ادبِ لطیف کا خزانہ
بہم پہونچا رہے ہیں۔ اللہ انہیں اور ملازموں کو ملازمت کی قید سے

---

[1] مسلمانوں عبرت حاصل کرو (تمکین)

آزاد کرکے ذرا "منصب[1] دار" یا "جاگیر دار" تو بنا دے، پھر بتا دینگے کہ یہ دنیا میں صرف انگریز بھائی ہی زندہ دل ہوتے ہیں یا ہم ہندوستانی بھی!

بھوپال
۶ اپریل ۱۹۳۱ء

مُلّا رموزی

[1] ۔ "ملّا صاحب کی دعا سے منصب تو نہیں اب بھی ہے خدا کرے اب ہماری دعا سے ملا صاحب کو منصب اور جاگیر ہو جائے (تمکین)

تقریب

از

مولوی عبد المنعم صاحب سعیدی

بی۔ اے (علیگ) ال ال بی (عثمانیہ) یم آر اے ایس (لندن)

میں چاہتا ہوں کہ کتاب پر کچھ لکھنے سے پہلے مصنف کے حالات بھی بیان کردوں تاکہ پڑھنے والے بے خبر نہ رہیں۔

تمکین صاحب کے اجداد ابتداً عرب سے بخارا گئے اور وہاں مستقل سکونت اختیار کرلی۔ چونکہ یہ لوگ ہاشمی النسل اور امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کی اولاد سے تھے اسلئے بخارا میں عہدہ ہائے جلیلہ پر فائز ہوگئے۔ ہندوستان میں سب سے پہلے سیّد بابا خواجہ سیاحت کناں وارد ہوئے اور پھرتے پھراتے دکن پہونچے تو حیدرآباد میں اپنے ہموطنوں اور خاندان کے لوگوں کو بڑی بڑی خدمات پر فائز دیکھ کر خود بھی مستقل سکونت اختیار کرلی سید محمد طالب میر عسکر بخارا اور سیّد محمد عسکری صدر الصدور انہیں کے ہم جد تھے جن کے پوتے نواب فریدوں جنگ رفیع الدولہ حیدر الملک تھے چونکہ اس زمانہ میں

پہلے نواب رفیع الدولہ حیدر الملک بہادر دکن کے مشہور امراء سے تھے جن کے پوتے نواب



[illegible] خاص طور پر یکجائی تھی اور تازہ ولایت شرفاء کو [illegible] تھا۔ اسلئے نواب میر معنی خاں[1] بہادر نے اپنی صاحبزادی سے جو نواب عبد اللہ خاں بہادر صوبہ دار آرکاٹ کی نواسی تھیں۔ سید بابا خواجہ کے فرزند سید ایوب خواجہ کی شادی کردی اور اس قرابت کے بعد سے ایوب خواجہ کی آمد و رفت دربار شاہی میں شروع ہوگئی۔ سید ایوب خواجہ کو پہلے میر سیادت علی خاں بہادر اور پھر سید یار جنگ خطاب معہ لوازمات اور تعلقہ مشکنی مدگل با جمعیت عطا ہوا۔

نواب سید یار جنگ بہادر کے کئی ایک لڑکے لڑکیاں تھیں چنانچہ سب سے بڑے فرزند نواب سید نور الحسن خاں بہادر تھے جو اورنگ آباد کے میر عدل اور صدر تعلقدار تھے اور خطاب خانی و بہادری کے علاوہ پانصدی منصب اور آٹھ ہزار سات سو اٹھانوے روپیے تنخواہ سے سرفراز تھے آپ سے نواب عزت یار خاں بہادر حکیم الحکماء محی الدولہ[2] کی صاحبزادی بیاہی گئی تھیں آپنے ۲۶ محرم ۱۲[illegible]ھ

---

[1] میر معنی خاں بہادر، پانصدی منصب اور لوازمات سے سرفراز تھے اور مشہور امراء سے تھے "کوچۂ میر معنی خاں" ابتک مشہور ہے۔

[2] عزت یار خاں بہادر محی الدولہ (ثالث) مغفرت منزل کے مصاحب اور معالج خصوصی تھے، خدمت صدارت اور احتساب بلدہ کے علاوہ جاگیر اور منصب سے بھی سرفراز تھے ۱۲۴۰ھ میں ایک مہدوی افغان نے جبکہ آپ مانے میں بیٹھے ہوئے تشریف لیجا رہے تھے نبض دکھانے کے بہانے سے حملہ کر کے شہید کر دیا

مطابق ۶ ارڈسمبر ۱۸۵۵ء کو انتقال کیا اور چار لڑکے اور دو لڑکیاں اپنی یادگار چھوڑیں جن میں سب سے بڑے نواب میر سیادت علیخاں بہادر تھے جو خدمت نیابت دوم دیوانی بلدہ اور آبائی منصب اور خطاب خانی بہادری سے سرفراز تھے۔

نواب سیادت علیخاں بہادر نے چار شادیاں کی تھیں چنانچہ چوتھی شادی نواب عزیز الدین خاں بہادر بخت بلند جنگ کی صاحبزادی سے کی جن کے بطن سے مولوی سید منتخب الدین تجلی تولد ہوئے۔

حضرت تجلی حیدرآباد کے مشہور شعرا سے تھے اور مولویوں میں شمار ہوتا تھا، عربی اور فارسی کی تکمیل مدرسۂ دینیہ نظامیہ اور دارالعلوم حیدرآباد دکن سے کی تھی۔ حدیث فقہ وغیرہ کی تعلیم خانگی طور پر پائی تھی فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے فارسی کلام ترک علی شاہ ترکی کو اور اردو نواب فصیح الملک داغ دہلوی کو دکھایا کرتے تھے۔

۱۲۹۲ھ

حضرت تجلی اپنے والد کے انتقال کے تیسرے روز ۹ ربیع الثانی م ۱۴ اپریل ۱۸۷۵ء کو تولد ہوئے چھٹپن تک اپنی خالہ نواب سلطان نواز جنگ بہادر کی بیگم صاحبہ کے زیر پرورش رہے اور سن و شعور کو پہونچنے کے بعد علاتی بہنوی نواب میر

غیاث[1] الدین علیخاں بہادر کے زیر نگرانی تعلیم پائی ۱۳۱۸ھ (۱۸۹۰ء) میں مولوی سید عبدالرحیم صاحب تعلقدار کی صاحبزادی اور مولوی سید محمد یوسف الدین مرحوم صوبہ دار گلبرگہ شریف کی ہمشیرزادی سے شادی کی ۱۳۱۱ف میں موعود الخدمتہ تحصیلداری ہوئے اور بحیثیت اٹاچی معتمدی مالگزاری میں کام کرتے رہے ۱۳۱۴ف سے مختلف تحصیلات پر منصرم تحصیلدار کی حیثیت سے کارگزار رہے ۱۳۱۶ف میں صوبہ داری گلبرگہ میں آپ کا تقرر ہوا اور ۱۳۱۸ف میں ضلع رائچور کے صدر خزانہ دار مقرر ہوئے ۱۳۲۲ف میں عثمان آباد کے محاسب ہو کر گئے۔ ۱۳۱۴ف سے ۱۳۲۳ف تک مستقلانہ خدمتہ تحصیلداری نہ مل سکی مگر ہمیشہ منصرم تحصیلدار رہے ۱۳۳۰ف میں گلبرگہ شریف پر خزانہ دار ہو کر آئے ۱۷ر صفر ۱۳۴۶ھ م ۱۶ر اگست ۱۹۲۷ء کو گلبرگہ ہی میں انتقال کیا۔ حضرت تجلی کو یوں تو کئی ایک لڑکے اور لڑکیاں ہوئیں مگر صرف تین لڑکے باقی رہے جن میں سب سے بڑے مولوی سید مصباح الدین تمکین کاظمی ہیں۔

تمکین صاحب ۲۶ر شعبان ۱۳۲۰ھ م ۲۷ نومبر ۱۹۰۲ء کو حیدرآباد

---

[1] یہی نواب غیاث الدین علیخاں بہادر تھے جو بعد کو حضرت بہبود علیشاہ قبلہ کے مرید اور خلیفہ ہو کر میر غیاث الدین علیشاہ بن گئے۔ مولوی قطب الدین محمود علی مرحوم معتمد پائگاہ آپ ہی کے فرزند تھے اور ڈاکٹر میر ریاست علی اور ڈاکٹر ولی الدین آپ ہی کے پوتے ہیں۔

میں تولد ہوئے ابتدائی تعلیم اپنی والدہ اور والد کے نگرانی میں پائی
اور پھر وہرم ونت اسکول، مدرسہ اعزہ، مدرسۂ منصبداراں، مدرسہ
مفید الانام اور دارالعلوم بلدہ میں فارسی، عربی اور انگریزی تعلیم پائی
چونکہ آپکی والدہ نے مولوی سید محمد یوسف الدین صاحب مرحوم صوبہ دار
گلبرگہ کی نگرانی میں تعلیم حاصل کی تھی اور نہایت تعلیم یافتہ خاتون تھیں
اسلئے آپکی ابتدائی تعلیم بھی نہایت عمدہ ہوئی۔ حضرت تجلی خود شاعر
اور ادیب تھے اور ہمیشہ علمی ادبی صحبتیں گرم رہتی تھیں اسلئے آپ پر
بھی خاصا اثر ہوا اور آپ نے بھی شعر کہنا شروع کیا ابتداً حضرت کیفی
حیدر آبادی کو غزل دکھاتے رہے اور پھر حضرت محمد علیخاں ناظم سے
مشورہ کیا مگر جلد ہی شاعری سے جی اکتا گیا اور ایک دیوان مکمل کرکے
شاعری ختم کردی اور یہ اچھا بھی ہوا۔

چونکہ نثر سے بہت دلچسپی تھی اسلئے مضامین لکھنے کا شوق ہوا ابتداً
اخبارات میں سیاسی اور اقتصادی مضامین لکھے گئے مگر بعد میں تاریخ
اور ادب سے کچھ ایسی دلچسپی ہوی کہ اسی کے ہو رہے۔

توہم السلطنتہ وزیر خارجہ ایران کے فرانسیسی سے فارسی میں ترجمہ
کئے ہوئے ناول "معاشقۂ نپولین" اور گیٹھے کے شاہکار "ورتھر" کا
ترجمہ میری شرکت میں فارسی سے اردو میں کیا اور آسکر وائیلڈ کے ڈرامے

"دی امپارٹنس آف بی انگ ارنسٹ" کو میری شرکت میں انگریزی سے اردو میں منتقل کیا۔ تقویم السلطنتہ کے ایک اور فارسی ناول "شورشِ پرتوگال" اور ملکم خاں ناظم الدولہ کے ڈراموں "تیاتر" کو بھی اردو کا جامہ پہنایا۔ چونکہ ریختی سے شغف تھا اور اس کا مطالعہ زیادہ کرتے رہے اسلئے شعراءِ ریختی کا ایک تذکرہ بھی ترتیب دیدیا اب اردو شعر کہنے والی خواتین کا ایک مبسوط تذکرہ ترتیب دے رہے ہیں جو اپنی نوعیت کے لحاظ سے ایک عمدہ چیز ہوگی اب تک سینکڑوں خواتین کے حالات اور کلام کے نمونے جمع کرلئے ہیں اور اس کاوش اور محنت سے اسکو ترتیب دے رہے ہیں کہ میرے خیال میں ابتدائے آفرینش اردو سے ابتک کی شاید ہی کوئی اردو شعر کہنے والی عورت ہوگی جس کا کلام انہوں نے نہ فراہم کیا ہو۔

آجکل ہیومرسٹ (خوش مذاق) میں وہ صفات ڈھونڈھے جاتے ہیں جو ایک نقال یا مسخرے یا بھانڈ میں ہونے چاہئیں اگر یہی معیار چند روز قایم رہا تو یقین ہے کہ ہندوستان میں کوئی خوش مذاق نہیں ملیگا بلکہ نقال، مسخرے، اور بھانڈ رسائل وصحائف کے اوراق پر منہ چڑھاتے نظر آئیں گے۔ غضب تو دیکھئے کہ آج ہر وہ شخص

ظرافت نگار بنا بیٹھا ہے جو حد درجہ گرے ہوئے اور رکیک مذاق سے
صرف لوگوں کو ہنسا دے اور بس زندہ دلانِ پنجاب نے وہ دادِ ظرافت
دی کہ نہ صرف ایسے بیہودہ نگار ادیب بنا دیئے گئے بلکہ خاصے ظرافت
نگار اور خوش مذاق بھی تسلیم کر لئے گئے۔ ع

طوقِ زریں ہمہ در گردنِ خرمی بینم

اردو ادبیات کا مطالعہ گہری نظر سے کیجئے تو معلوم ہوگا کہ اس
فن کو اردو میں مستقل طور پر سب سے پہلے منشی سجاد حسین نے اختیار کیا اور
نہایت عمدگی سے لکھتے رہے ان کے بعد اور لوگوں نے کوشش کی مگر کوئی
خاص بات پیدا نہ کر سکے عظمت اللہ خاں مرحوم اور رشید احمد
صدیقی نے اسی رنگ کو ذرا بدل کر بالکل علمی بنا دیا اور موٹے موٹے
فلسفے اور نفسیات کے مسائل اسی طرز انشا میں ادا کرنا شروع کیا
مگر ان حضرات کے مضامین کا معیار ذرا بلند تھا اسلئے عام لوگ انہیں
زیادہ پسند نہیں کرتے تھے اور یہ رنگ زیادہ مقبول نہیں ہوا خدا
غریق رحمت کرے عظمت اللہ خاں نے بے وقت داغ مفارقت
دیا اور رشید صدیقی نے مکروہات دنیا میں پھنس کر چپ سادھ لی
ان کے بعد پطرس نے لائٹ ہیومر لکھنا شروع کیا اور خوب لکھا مگر
دو ہی ایک مضمون پطرس کے ایسے ہیں جو مقبول ہوئے چنانچہ

"کتے" اور "میں بھی ایک میاں ہوں" کے بعد کوئی مضمون ان کا اس قابل نہیں رہا جو قابل تذکرہ ہو یقین نہ ہو تو "مضامین پطرس" دیکھ لیجئے اسی زمانہ میں مولوی مرزا فرحت اللہ بیگ نے بھی لائٹ ہیومر لکھنا شروع کیا اور خوب لکھا۔

مضامین فرحت حصہ اول و دوم دیکھ ڈالئے "مشاعرہ" "ڈپٹی نذیر احمد کی کہانی" "عالم بے کسی اور بے بسی" اور "کل کا گھوڑا" فرحت صاحب کے شاہکار ہیں۔

ملا رموزی نے بھی عجیب دل و دماغ پایا ہے ابتداً گلابی اردو کی سوجھی تو وہ وہ باریکیاں دکھائیں کہ سبھوں نے لوہا مان لیا اور پھر "نکات" کی طرف توجہ کی تو خاصا "لائٹ ہیومر" لکھنے لگے چنانچہ "نکات رموزی" حصہ اول و دوم "صبح لطافت" "شادی" جیسے ضخیم چار مجموعے مکمل کر دیئے اور اب "عورت ذات" کے نام سے ایک مستقل کتاب زیر طباعت ہے اور مختلف رسائل میں ان مجموعوں کی طباعت کے بعد جو مضامین طبع ہوے وہ خود اتنے ہیں کہ انہیں طبع کر دیا جائے تو اور دو تین مجموعے ہو جائیں۔

ملا رموزی نے سادگی بیان اور ظرافت کو پیش نظر رکھکر لکھنا شروع کیا اور اسی سلسلہ میں علمی، ادبی، اخلاقی، سیاسی، فلسفی، معاشی،

ہر قسم کے رموز و غوامض قلمبند کرتے رہے مگر اس اطمینان سے کہ پڑھنے والا سمجھے اور سمجھ کر ہنسے اور پھر غور کرے۔ شگفتگی تحریر اور طنز نگاری ملّا صاحب کا طرۂ امتیاز رہی ہے بعض مضامین ملّا صاحب کے ایسے بھی طبع ہو جاتے ہیں جو ان کے اپنے رنگ میں رنگے ہوئے نہیں ہوتے اسکی وجہ انکی عدم توجہی نہیں ہوتی بلکہ "اجرتی مضمون" بے وقت لکھنا اور "غیر خوش باشانہ" (بغیر موڈ) وقت کی فکر کا نتیجہ ہوتا ہے مگر ان سے قطع نظر کر لیجائے تو ملا صاحب اس کے مستحق ہیں کہ انہیں ہیومرسٹ مانا جائے اور بہترین ظرافت نگار تصور کیا جائے انہیں دنوں امتیاز علی صاحب تاج نے بھی "چچا چھکن" کا سلسلہ شروع کیا اور خوب لکھنے لگے مگر ایک ہی دو مضامین کے بعد انہوں نے اسے ختم کر دیا۔

اس کے بعد سے تو ایک طوفان بدتمیزی بپا ہو گیا۔ ہر نا اہل و ناکارہ نے خوش مذاقی شروع کی کسی نے بڑے طمطراق اور شان و شوکت سے لکھنا شروع کیا تو کوئی فتنۂ محشر بن بیٹھا کسی نے اظہار انکسار کیلئے نا اہلی اور ناکارگی کا اعلان کر دیا تو کوئی "فقط کوئی" ہو کر رہ گیا مختصر یہ کہ

ہر بوالہوس نے عشق پرستی شعار کی
آپ ہی کہئے کہ آبروئے شیوۂ اہل نظر کیا باقی رہتی ہے؟

اس کے ذمہ دار یہ رکیک نویس اور ناکارہ نگار نہیں ہیں بلکہ مدیران رسائل اور رئیس التحریران مجلات و اڈیٹران جرائد ہیں۔ برساتی کیڑوں کی طرح رسائل اُبل پڑے مگر لکھنے والے وہی رہے جو پہلے تھے بھلا ایک ایک آدمی کتنے کتنے رسائل کیلئے مضامین لکھتا؟

نتیجہ یہ ہوا کہ پرانے لکھنے والوں نے اِن جدید رسائل کی طرف سے کم توجہی برتی اور وہ "اطفالِ دبستاں" جو ابھی "مدرسوں" ہی کی چہار دیواری میں خواب طفلی دیکھ رہے تھے اور روزانہ اوٹ پٹانگ مضامین لکھ لکھ کر رسائل کو بھیجا کرتے تھے اور وہ ردی کی ٹوکری میں ڈال دیئے جاتے تھے اب خاصے ادیب، ظرافت نگار اور کیا اور کیا بن گئے ؂

شاباش کیا کہنا ترقی اسکو کہتے ہیں
نہ ترشے تھے تو پتھر تھے جو ترشے تو خدا ٹھیرے

رسائل کی بہتات اچھے لکھنے والوں کا فقدان اور ایسے ناکاروں کی کثرت اب بھلا اردو کی پہلی تک پڑھے ہوئے "رئیس التحریر" اور "مغزن المفردات" تک پہونچے ہوئے "حکیم جی" انہیں ناکارہ نگاروں کو کار آمد سمجھ کر نہ چھاپیں تو کیا کریں کیونکہ عرب میں گھوڑے جب گراں ہو گئے اور لوگوں میں خریدنے کی استطاعت نہیں رہی تو

کام لینے لگے لمبے کان والے جانور سے! یہی ترکیب اگر پنجاب لکھنؤ دلی کے رسالے والوں نے کی تو کیا بُرا کیا؟ آپ کو بُرا ماننے کا کیا حق ہے ضرورت ایجاد کی ماں ہے!

اس زمانہ میں جبکہ یہ بے تکی چل رہی ہو کوئی شخص کسی اچھے لکھنے والے کے مضامین پیش کرے تو کس طرح پیش کرے تمکین صاحب نے تو سرے سے مقدمہ لکھنے کی مخالفت ہی کی تھی صرف مجھ سے خواہش کر رہے تھے کہ ترتیب پر اظہار خیال کر دوں مگر بغیر ان چیزوں کے اظہار کے جو قبل ازیں ظاہر کی گئیں اظہارِ خیال بے کار تھا اور پھر سرسری اظہار خیال کرنے سے نہ کرنا اچھا تھا چنانچہ مجھے مجبوراً ان چیزوں کو ظاہر کرنا پڑا ممکن ہے کہ اِن سطور سے بعض لوگوں کو تکلیف ہو اور بعض ہی خواہانِ ناکارگان خیر خواہانِ ظرافت نگاران باعظمت و شوکت نعل در آتش ہو جائیں اور مدیران و رئیس التحریران کو بھی اِن الفاظ سے تکلیف ہو مگر مجبوری یہ ہے کہ

اَلحَقُّ مُرٌّ

انہیں حضرات کی خفگی اور دل آزاری کے خوف سے ہم نے چند اشارے کر دیئے ہیں ؎

اندکے از غمِ دل گفتم و خاموش شدم　　که تو آزردہ شوی ورنہ سخن بسیار است

(اقبال)

تمکین کی ظرافت نگاری میں آپ کو عام جملے ملینگے نہ پیٹنٹ فقرے اور نہ وہ رکیک مذاق نظر آئے گا جو عام طور پر آج کل کے مضمون نگاروں میں پایا جاتا ہے۔

حضرت ملا رموزی سیاسیات کی وجہ مشہور ہوئے۔ مولوی مرزا فرحت اللہ بیگ نے گذشتہ تہذیب و تمدن کے ماتم میں نام پایا۔ پطرس نے چند بے ساختہ جملوں کو جوڑ کر خاص کیفیت پیدا کر دی اور بس انھیں سے مرزا فرحت اللہ بیگ صاحب کی زبان کا کیا کہنا ماشاء اللہ دہلی کی میٹھی میٹھی آب حیات سے دھوئی ہوئی زبان صاف ستھرہ روزمرہ ملا رموزی صاحب کی اردو بھی ماشاء اللہ بامحاورہ اور اچھوتی۔ البتہ پطرس صاحب گو تنے کا استعمال اور "زندہ دلوں" کی طرح غلط نہیں کرتے مگر زبان پر تب بھی "امروہہ پن" خاصا موجود ہے باوجود سلاست نگاری کے ایک وزن پڑھنے والے کے دل اور دماغ پر مسلط ہو جاتا ہے اور زبان بھی ذرا لڑکھڑانے لگتی ہے

اُن کے مقابلہ میں تمکین صاحب کی زبان پطرس سے کروڑ درجہ بہتر ملا رموزی کے برابر برابر ہے۔ انکی زبان میں مرزا فرحت صاحب کی سی مٹھاس اگر نہیں تو گراں باری بھی نہیں ہے میری دانست میں ملا رموزی، مرزا فرحت اور تمکین تینوں اپنے اپنے رنگ میں کامل ہیں

دین اللہ کی ہے رنگ ہے اپنا اپنا

جی چاہتا ہے ان تینوں ظرافت نگاروں کے مضامین کا مقابلہ کر کے دکھاؤں کہ کس پر کس کو فوقیت ہے مگر میرا منشا یہ نہیں کہ تمکین کو ملا رموزی یا فرحت آکا سے بڑھا دوں میں نے پہلے ہی کہہ دیا ہے کہ تینوں اپنے اپنے رنگ میں رنگے ہوئے ہیں۔

تمکین میں فرحت آکا سی بے ساختگی اور شیرینی الفاظ موجود ہی تو ملّا رموزی کی سی طنز نگاری اور چلبلاہٹ بھی بدرجۂ اتم ہے۔ پطرس کی سی لطافت خیال ہے تو سجاد کی سی جدت بھی ہے بہر حال میں خوش ہونگہ آج وہ چیز پیش کر رہا ہوں جو ہر حیثیت سے کامل ہے اور میں جس شخص کو پیش کر رہا ہوں وہ موجودہ دور کے لکھنے والوں سے بہتر نہیں تو بد تر بھی نہیں۔

اردو میں سرے سے لائٹ ہیومر (خوش مذاقی) ہی مفقود تھا اگر کچھ تھا بھی تو صرف مزاحیات کی حد تک تنقید نگاہی اور طنزیات سے لوگ آشنا ہی نہ تھے بعض لوگوں نے ایک آدہ مضمون لکھ دیا مگر کسی نے مستقل طور پر "نگاہیات" کو اپنا عنوان نہیں بنایا اسی کی ایک کڑی تشخص نگاری بھی تھی جو سرے سے اردو میں تھی ہی نہیں اردو میں تشخص نگاری کو مستقل طور پر رواج دینے اور اس موضوع پر بے تکلف قلم اٹھانے کا

فخر اگر کسی کو حاصل ہے تو وہ تمکین ہیں کہ انہوں نے "میر صاحب" "مرزا صاحب"
"خانصاحب" "مولوی جی" "منشی جی" لکھ کر بقول وکٹر ہیوگو یہ ثابت کر دیا کہ

"ہر ایک چیز کا ایک عنوان اور ہر چیز کسی صاحب کمال کی
منتظر ہے وہی پیش پا افتادہ باتیں جن پر ہم قلم اٹھانا کسی
زمانے میں خلاف علمیت سمجھتے تھے آج دنیا کے ادب میں
عظمت کی نگاہوں سے دیکھا جاتا ہے اور ان پر روشنی ڈالنا
معراج کمال کا ثبوت ہے"

ہربرٹ ایلس کہتا ہے۔

"جو کچھ دنیا میں ہو سکتا ہے بیان کیا جا سکتا ہے مگر ضرورت ایسے
آدمی کی ہے جو اسے بیان کرنا جانتا ہو"

اسکو پیش نظر رکھکر آپ "چارلی چاپلن کا تماشا" "بوکھلاہٹ"
"مضمون کیسے لکھتے ہیں"۔ "ہم اور ہماری عید"۔ "ہم مضمون کیوں نہیں
لکھتے" پڑھئے دیکھئے کیسے پیش پا افتادہ اور روزمرہ کے واقعات
کس مزے سے بیان کئے گئے ہیں۔ یہی حادثات آپ پر بھی گزرتے
ہیں۔ مگر آپ انہیں قلمبند نہیں کر سکتے اسی لئے تو "نوالس" نے کہا ہے
"ہماری زندگی کے تمام واقعات مواد ہیں جن سے ہم جو چاہیں
بنا سکتے ہیں"

مگر اس مواد سے کام لینا ہر ایک کا کام نہیں ہے اسکے لئے کسی تکمین ہی کی ضرورت ہے۔

ادب اس کا نام نہیں کہ ہائے وائے کے دُم چھلوں کے ساتھ چند نامربوط اور بے تکے الفاظ جوڑ دیئے جائیں اور نامانوس ترکیبوں کے ساتھ ایک مضمون مرتب کر دیا جائے کہ "وہ ناچ رہی تھی اور میں مر گیا" اور اسی بات کا تبنگڑ بنا کر صفحوں کے صفحے سیاہ کر دیئے جائیں آج کل عام رجحان اس قدر خراب ہو گیا ہے اور بد ذوقی اتنی عام ہو گئی ہے کہ ہر ایسا مضمون جسکا تذکرہ کیا گیا ادب لطیف خیال کیا جاتا ہے۔ عجب ثم العجب! "سیتھوار نلڈ" کہتا ہے۔

"ادب انسانی زندگی کی تفسیر ہے"

اسکی توضیح "آردی گاربان" نے اسطرح کی ہے۔

"کسی چیز کو دیکھنے کے بعد اسکے متعلق جو خیالات ہمارے دماغ میں پیدا ہوں انہیں بہترین الفاظ میں قلمبند کر دینا ادب ہے"۔

آپ "جھوٹ"۔ "جھٹکا"۔ "منشی جی" کا مطالعہ کیجئے اور پھر ان دونوں اقوال پر غور کیجئے خود سمجھ میں آجائے گا کہ ادب کیا ہے حیدرآباد دکن کی طرز معاشرت تاریخ اور تمدن سے جس قدر ان مضامین کو تعلق ہے اتنا ہی ادب سے بھی تعلق ہے یوں تو دکن کی

سینکڑوں تاریخیں لکھی گئیں لیکن کسی میں بھی آپ کو حیدرآباد کے معاشرتی پہلو تمدنی نکات اور معاشی باتیں نہیں ملینگی مگر آپ "میر صاحب" "مرزا صاحب" "مولوی جی" "منشی جی" "خانصاحب" "گھبراہٹ" "جھوٹ" "جھٹکا" پڑھ کر حیدرآباد کی سینکڑوں ایسی باتوں سے واقف ہوجائینگے جنھیں کبھی آپ نے سنا ہی نہیں ہے۔

کبھی آپ حیدرآباد کے محرم میں "لنگر" دیکھ رہے ہونگے۔ "رنگ" کھڑا ہوا نظر آئے گا۔ "نعل صاحب کی سواری" "ندی کا میلہ" بھی آپ کے پیش نظر ہونگے تو کبھی آپ "حیدرآباد کی طغیانی" کے حالات پڑھ کر یہ محسوس کرنے لگیں گے کہ آپ کے سامنے ہی سب کچھ ہوا ہے، کہیں آپ کو "آخری چہارشنبہ" کے جلسے اور تعلیم یافتہ نوجوانوں کی پارٹیوں کا حال نظر آئے گا تو کہیں حیدرآباد کی سب سے پہلی اجرت پر لکھنے والی ہستی "منشی" کو دیکھیں گے کبھی آپ کو حیدرآباد کے "جھٹکے" اور "جھٹکے والے" سے روشناس کرایا جائے گا تو کبھی "سیکل" سے بہرحال آپ از جزو تا کل چھوٹی سے چھوٹی بات تک دیکھ لینگے اور محسوس کرنے لگیں گے کہ حیدرآباد کیا تھا کیا ہوگیا اور آئندہ کیا ہونے والا ہے؟

کون کہہ سکتا تھا کہ "طغیانی" میں برباد ہوکر حیدرآباد پھر

"عروس البلاد" نے کا کسے خبر تھی کہ محرم کے "رنگ" "سوانگ" "میلے ٹھیلے" "جاترا" "جھگڑے" اسطرح غائب ہو جائیں گے کہ آج ان کا تذکرہ گذشتہ تہذیب تمدن کی یاد دلانے والا ثابت ہوگا کسے خبر تھی کہ حیدرآباد سے "پتنگ بازی" "مرغ بازی" "بیڑ بازی" "کشتی" "بنوٹ" بانک۔ پھری۔ گدکا۔ جاکر۔ سینما۔ ناٹک۔ ٹاکنگ فلم۔ ٹینس۔ اور بیاڈ منٹن "رہ جائیں گے۔ کون کہہ سکتا تھا کہ "رتھ" برقعہ گاڑی۔ ڈولی۔ میانہ۔ پالکی۔ نالکی۔ ہودہ۔ عماری شکرم۔ جوڑی۔ چوکڑا۔ جاکر۔ جھٹکہ سکتا رہ جائیگا اور "موٹروں" کی وہ کثرت ہو جائے گی کہ بہترین سے بہترین کار ہر گلی کوچے میں "تیار ملیگی" کون واقف تھا کہ حیدرآباد والے شاہا۔ جھبیہ۔ عمامہ۔ شملہ۔ انگرکھا۔ کلی چھوڑ کر "ترکی" اور ایرانی بلکہ امان اللہ خانی "ٹوپی پر اتر آئیں گے اور شیروانی کو ملکی لباس بنالیں گے۔ ساتھ ہی ساتھ "کوٹ پتلون۔ ٹرکش کوٹ" واٹر پروف بھی جزو لباس ہو جائیں گے اور فلٹ کیپ اور سن ہیٹ کا عام رواج ہو جائے گا سچ ہے۔

زمانہ ایک طرح پر کبھی نہیں رہتا
اسی کو اہل جہاں انقلاب کہتے ہیں

تمکین کے ان مضامین سے آپ کو حیدرآباد کی عام اخلاقی
حالت بھی کما حقہٗ معلوم ہو جائے گی۔ "رسکن" کہتا ہے۔

"کسی قوم کا ادب اسکی اخلاقی حالت کا صحیح ترجمان ہوتا ہے"

"عورت اور اسکی نفسیات" پر تمکین مدت سے عبور حاصل کر رہے
ہیں، چنانچہ اس موضوع پر انہوں نے ذاتی مشاہدے اور شخصی مطالعہ
کے علاوہ بہترین ذخیرۂ کتب بھی فراہم کر لیا ہے، چنانچہ آپ "عطردان"
"بدحواسی"، "چارلی چاپلن کا تماشا"، "بوکھلاہٹ۔ ہم اور ہماری عید"
"مضمون کیسے لکھتے ہیں۔ ہم مضمون کیوں نہیں لکھتے۔ شادی سے پہلے
پڑھ کر اس کا اندازہ کر سکیں گے کہ تمکین نے عورت کو کس قدر سمجھ لیا ہے

یہ معلوم کر کے آپ کو حیرت ہوگی کہ تمکین ابتک مجرد ہیں۔ اللہ
واسطے کو "منگنی" تو کر لی ہے[1]۔ مگر اس بے تکلفی سے عورت کے متعلق
قلم اٹھاتے ہیں کہ بعض لوگوں کو اس امر کا یقین اور پختہ یقین ہے کہ
تمکین شادی شدہ اور "گھر داماد" ہیں[2]۔

انہیں مضامین سے آپ کو تمکین کے چند خاص خاص اور زیادہ
ملتے جلتے رہنے والوں کا کردار (کیرکٹر) بھی معلوم ہو جائے گا اور

---

[1] انشاءاللہ کبھی شادی بھی کر لینگے۔ [2] خدا نکرے۔ (تمکین)

پھر خود تمکین کا "نظام الاوقات" بھی نظر آئے گا اور مصروفیتیں بھی ــــ

ان مضامین میں تمکین نے اپنی زندگی کے اکثر واقعات کو بالکل صحیح طور پر بے نقاب کر دیا ہے اور ایسے پوست کندہ حالات جنکو ظاہر کرنا لوگ عین بدنامی تصور کرتے ہیں تمکین نے بکمال جراتِ اخلاق لکھ دیا ہے اور اس مزے سے کہ

من نہ کردم شما حذر بکنید

کہنے کے بجائے ان واقعات کا اظہار بے انتہا مفید اور ناصحانہ ثابت ہوگا۔ ممکن ہے کہ آئندہ کوئی شخص تمکین کی سوانحِ حیات لکھنے بیٹھے تو یہ واقعات اسے مواد کا کام دینگے[1]

ہندوستان نااتفاقی کے ہاتھوں برباد ہو رہا ہے مگر علمی اور ادبی برادری کو کم از کم اس نجاستِ نااتفاقی سے آلودہ نہ ہونا چاہئیے تھا مگر اس کا کیا علاج کہ یہ طبقہ بھی اس "حمام" میں "ننگا" ہی نظر آتا ہے۔ مجھے یہ دیکھکر سخت تکلیف ہوتی ہے کہ تمکین سے رشک حسد، اور بغض رکھنے والوں کی تعداد بہت کافی ہو گئی ہے بعض تو محض اسلئے تمکین سے بغض رکھتے ہیں کہ انکو اس قدر شہرت کیوں ہو

---

[1] خدا کرے ایسا ہی ہو۔ تمکین

اور بعض اس لئے کہ یہ جو عمدہ عمدہ اور لطیف ترین مضامین تمکین کے قلم سے نکلتے ہیں۔ ہمارے نام سے کیوں نہیں چھپتے! یہ تو ان لوگوں کا حال ہے جو لکھے پڑھے ہیں۔ مگر بعض ایسے لوگ بھی جو "اردو کی چوبھتی" اور "آمدن سی لفظی" کے علاوہ اور کچھ بھی نہیں جانتے اب تمکین کے خلاف پروپاگنڈا کرنے لگے ہیں۔ گو تمکین کو اِن حاسدوں کے پروپاگنڈے کا افسوس ہوتا ہے اور نہ ان کے اسطرح جل جل کر کلا بتوں" ہونے کا رنج مگر یہ کس قدر رنج دہ بات ہے کہ وہ "بدوی" جو نہ تو مہذب اور متمدن ہی ہوں اور نہ انہیں "قہوہ خانے" یا "حرذے کی دوکان" کے علاوہ کوئی سوسائٹی ہی ملی ہو جو ایک سطر اردو لکھ سکتے ہوں اور نہ ایک سطر عربی اور فارسی پڑھ سکتے ہوں اور نہ ایک لفظ انگریزی کا سمجھ سکتے ہوں ایک ایسے قابل اور فاضل ادیب اور انشا پرداز سے خواہ مخواہ حسد رکھتے ہیں ظاہر ہے کہ ان کا کوئی مقابلہ ہی نہیں اگر کوئی دوسرا انشاء پرداز یا پڑھا لکھا شخص تمکین سے محض انکی شہرت اور عزت کی وجہ پر رشک و حسد کرتا تو کوئی بات نہ تھی۔ اِن "طویل القامتوں" کو معلوم ہونا چاہئے کہ بقول "لنکن"

"تم کچھ لوگوں کو بے وقوف بنا سکتے ہو اور سب لوگوں کو تھوڑے

عرصے کیلئے دہوکا دے سکتے ہوئے، مگر ہمیشہ سب لوگوں کی آنکھوں میں خاک نہیں ڈال سکتے۔"

کیونکہ علمی اور ادبی حلقے میں اُن حاسدوں کا گذر نہیں اور اگر کسی "یورپ زدہ ڈاکٹریٹ" کی جوتیوں کے طفیل میں گذر ہو بھی گیا تو کون انکی شخصیت سے متاثر ہوتا ہے اور ایک ایسے قابل انشاپرداز اور ادیب کے مقابلے میں کچھ کہنے سننے کا موقع دیتا ہے آخر یہ خود ذلیل ہونگے۔[1]

مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ تمکین کے اس مجموعۂ مضامین کی جس پر میں "تقریب" لکھ رہا ہوں خاصی مخالفت ہوگی اور یہ نام نہاد ظرافت نگار اور "بدوی" حتی الامکان جد و جہد کرینگے۔ مگر اس سے کیا ہوتا ہے "ایمرسن" نے کیا اچھی بات کہی ہے۔

"دوستانہ کوشش یا مخالفانہ جد و جہد کی بناء پر تمام"
"کتابوں کو استقلال نصیب نہیں ہوا ہے بلکہ ان کو"
"شہرت اور دوام انکی مخصوص کشش کی وجہ حاصل ہوئی ہے"

چونکہ "غنچۂ تبسم" میں ایک مخصوص کشش ایک شہرت پانے کی قوت

---

[1] مجھے نہایت افسوس ہے کہ سعیدی صاحب نے بہت سخت لہجہ اختیار کیا ہے اور پھر اس حصے کے شائع کرنے پر مصر بھی ہیں (تمکین)

اور ایک ادبی وزن موجود ہے اسلئے یہ کتاب مقبول ہوگی اور خوب مقبول ہوگی۔ اور ایک دن وہ آئے گا کہ بقول حضرت احسن مارہروی
"تمکین کی نثر اکبر الہ آبادی کی نظم کی طرح بقائے دوام حاصل کریگی"

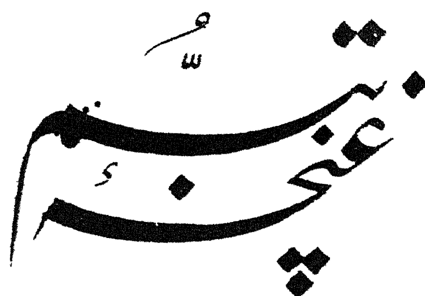
اور

پہلے پھولیگا یہ غنچہ گلستاں بوستاں ہوکر

غازی پورہ ۔ گلبرگہ
۱۲؍ اپریل ۱۹۳۱ء

عبدالمنعم سعیدی

خوش باش دمے کہ زندگانی این است



مندرجات

صحت نامہ

صفحہ	سطر	غلط	صحیح	صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۱	۵	ترفا	شرفا	۲۹	۱	رمضان شریف	شعبان
۲	۳	طبقہ	تختہ	۳۴	۹	بذوۃ العلما	ندوۃ العلما
۳	۲	شکشپیر	شکسپیر	″	۱۳	زوز	زور
″	۶	بلانگ	بلانک	۳۵	۱۳	لزیز	لذیز
۴	۱۳	زموزی	رموزی	۴۸	۱۶	زور روز	زور زور
۵	۱۳	جنھوں بے	جنھوں نے	۶۲	۱۱	گولڈن تش	گولڈرش
۱۲	۹	ہواگزرا	ہو گزرا	۷۴	۷	خرانوں	خراٹوں
۱۹	۶	روز	زور	۷۷	۱	جیدار	گرجدار
″	۶	سلامت	سلاست	۹۵	۷	افرجاتی	نافرمانی
۲۶	۱۱	صاحب بے	صاحب نے	۹۷	۱	سکرٹ	سگرٹ
″	۱۷	موجودہ	موجود	۱۰۱	۱۴	بلاٹنگ	بلاٹنگ
۲۷	۳	ہامونیم	ہارمونیم	۱۱۳	۱۰	ڈاگ	ڈاک

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۱۱۷	۲	قلعہ کوجانے	قلعہ جانے
۱۱۸	۴	ستم علی	رستم علی
۱۱۹	۳	ٹھنڈے بانی	ٹھنڈے پانی
"	۴	کروٹ لی	کروٹ بدلی
"	۵	اٹھایا	اٹھالیا
"	۸	گودسے ترپڑا	گودسے اترپڑا
"	۱۵	ہی	لہتی
"	"	آگے بڑھکر	آگے بڑھ کر
"	"	بلائین	بلائیں
۱۶۹	۱۶	مس	میں
۱۲۱	۶	بیہ	یہ
۱۲۲	۲	ہمارے	ہماری
۱۲۸	۵	لکشمندت	لکشمیدت
۱۳۳	۶	ممگن	ممکن
"	۱۳	پہ	یہ
۱۵۳	۱	کسی کھولے	کس کے کھولے
۱۵۵	۶	گرٹ	گزٹ
۱۵۷	۱۷	بگہی	بگھی
۱۵۹	۱۷	سعد	بعد
۱۶۱	۱	ہی	یہی
۱۶۶	۱۴	لارانی پلانٹ	لارالاپلانٹ
۱۹۰	۱۲	پاند	باندہ
۱۹۱	۱۴	متلاشی کے	متلاشی کہ

گپ

اللہ اللہ وہ بھی ایک زمانہ تھا کہ ہر ایک شریف آدمی کی بیٹھک میں
یا دیوان خانہ پر یار دوست جمع ہوتے تھے۔ حقہ پر حقہ تازہ ہوتا سماور پر سماور
ختم ہوتا فنجانوں پر فنجانیں چڑھائی جاتیں بیڑے پر بیڑا چبایا جاتا اور گپیں
اڑتیں، اور ایک یہ زمانہ بھی ہے کہ لوگوں میں گپ کا مذاق ہی نہیں کہ گپ
کیا ہے، بس یہ سمجھ لیا ہے کہ گپ افیونیوں یا مداکوں ہی کی خاص چیز ہے شرفا
اور تعلیم یافتہ طبقہ اس سے قطعاً ناواقف ہے۔

حضرات! گپ بھی ایک فن ہے فنون لطیفہ میں سے اسکی ابتدا
جنت میں حضرت معلم الملکوت نے کی وہی اسکے موجد ہیں دادا آدم سے وہ
پہروں گپ بازی کیا کرتے تھے، حضرت آدم جب روئے زمیں پر تشریف
لائے تو ان کے پاس دل بہلانے کی یہی ایک چیز تھی۔ اماں حوا اور بابا آدم
ملکر اسی سے دل خوش کرتے تھے جوں جوں زمانہ بدلتا گیا تمدن و تہذیب نیا

ترقی ہوتی گئی گپ نے بھی ترقی کی اور اعلیٰ مدارج حاصل کئے آج یہ ایک مستقل
فن ہے اسکے جاننے والے بڑی قدر کی نگاہوں سے دیکھے جاتے ہیں۔
یونان میں بڑے بڑے گپ باز گزرے ہیں انہیں بزرگوں نے تو طبقہ
الٹوا دیا، عرب میں بھی اس فن کے آئمہ قبل از جاہلیت اور بعد از جاہلیت
گذرے ہیں علامہ واقدی جنکی تاریخ اور حدیثیں مشہور ہیں اس فن کے امام تھے
انہوں نے نہایت سنجیدگی سے گپیں جمع کیں اور شہرت دی مگر یار لوگوں نے
خواہ مخواہ انکی روایتوں کی تکذیب کی ایسے ثقہ امام گپ کو کاذب غیر ثقہ قرار
دیکر انکی گپوں (حدیثوں) کو جھوٹی ٹھیرایا، ایک اور بزرگ بھی قدرت سے
یہی دل و دماغ مانگ لائے تھے، چونکہ علامہ واقدی کا انجام پیش نظر تھا۔
اس لئے انہوں نے "الف لیلہ" لکھی یہ بھی مجموعہ ہے گپوں کا جس کو اس قدر
شہرت ہوئی کہ تمام مہذب زبانوں میں ترجمہ ہوگیا، عجم میں بھی اس فن کے بڑے
بڑے امام ہوئے دیکھئے "شاہ نامہ" کتنی بڑی گپ ہے جو ابتک چلی آرہی ہے
سکندر نامہ (جو امتحان منشی میں تا جنگ زنگیاں پڑھایا جاتا تھا) بھی ایک
گپ ہی ہے، چچا سعدی نے بھی گلستاں میں نہایت سلیقہ سے گپیں لکھدیں
جن کو پڑھ کر لوگ ابتک چکر میں ہیں اکثروں کو یہ خیال ہے کہ وہ ہندوستان
آئے تھے، حالانکہ انہوں نے ایک گپ ٹھونکدی۔
یورپ میں بھی سلیقہ شعار گپ باز بہت ہوئے میاں رینا لڈ

اس فن میں طاق تھے۔ انکی جس قدر تصانیف ہیں وہ بہت سنجیدہ یا غیر سنجیدہ
گپ کی تعریف میں داخل ہیں بھائی شکسپیر نے بھی اس فن میں کمال کیا ہے
اناطول فرانس، وکٹر ہیوگو، گیٹے، برناڈ شا بڑے بڑے گپی ہیں ان میں سے
دو نے تو "نوبل انعام" بھی اسی گپ بازی کے صلہ میں پایا، آرتھر کینن ڈائل بھی
بڑے حضرت ہیں۔ انہوں نے ایک طرف روحانیت میں گپ بازی کی اور دوسری
طرف شرلک ہومز جیسی گپ چھوڑی، مارس لی بلانگ کو خدا سلامت رکھے انکی
گپیں لال برادرز کے طفیل میں لالہ تیرتھ رام جی ترجمہ کر رہے ہیں۔ ان کی جیتی
جاگتی گپ آرسین لوپن ہے، یہ ادبا کا طبقہ تھا۔ علما اور ماہران فنون بھی اس
لطیف شئے کو نہیں بھولتے میاں ڈارون نے ایسی گپ دی کہ آج تک لوگ
چکرا رہے ہیں بعض بزرگ معمل، یا رصدگاہ میں بیٹھے بیٹھے نئی نئی گپیں اڑا دیتے
ہیں کوئی کہتا ہے کہ آیندہ سو سال میں انسان چھ انچ کا رہ جائے گا تو کوئی
چوبیس گھنٹے میں دس منٹ کی نیند کافی ہونے کا اعلان کرتا ہے کوئی ستارو کے
ٹکرانے سے آدھی دنیا کی تباہی کی خبر دیتا ہے۔ تو کوئی عالمگیر جنگ کا اعلان
کرتا ہے، بہر حال ہر سنجیدہ شخص مصروف گپ بازی ہے۔ خدا رکھے ہندوستان
جنت نشان کو یہاں بھی یہ فن شریف بہت ترقی کر چکا ہے۔ بعض گپیں
سینکڑوں سال سے چلی آتی ہیں "کلیلہ و دمنہ" والی گپ کیسی ہے "کوک شاستر"
یا "کوکا پنڈت" والی گپ سے عقلمند نا شر اب تک فائدہ اٹھا رہے ہیں مگر یہ

ہندی یا بھاشا کی گپیں تھیں۔ اردو پیدا ہوئی تو یہ فن اس میں بھی جذب ہو گیا خواجہ امان نے "بوستان خیال" کی سی طویل گپ چھیڑ دی جو ابتک غیر مکمل ہے ہندوستان کے بڑے بڑے تاریخی واقعات بھی اس فن شریف کی بدولت ہوئے دہلی کی بچی کھچی سلطنت ان ہی گپ بازوں نے ٹھکانے لگائی ۱۸۵۷ء کا غدر بھی ایک معمولی گپ کا نتیجہ تھا جلیان والا باغ بھی اسی گپ کے طفیل مشہور ہوا "کلکتہ کے کالے کمرے" والی گپ بھی آپ نے تاریخ میں دیکھی ہو گی۔ مہاتما جی کی سوراج والی گپ کا کیسا زور و شور رہا مولانا محمد علی کی ہندو مسلم اتحاد کی گپ کیسا کام کر رہی ہے۔ حسن نظامی کی ایک چھوٹی سی "پان اسلام زم" والی گپ کی وجہ مولانا محمد علی کیسے بگڑے خواجہ صاحب کی تبلیغ والی گپ کتنی کامیاب گپ ہے،

ان کے علاوہ ہندوستان میں اور بھی گپ باز ہیں سر رابندرا ناتھ ٹیگور نے گپ میں شاعری کی اور "نوبل انعام" ہتیا لیا۔ منشی پریم چند کی افسانہ نما گپیں اور منشی سدرشن کی گپیں۔ اور ہیا زموزی کی مختصر اور مفید گپیں حوادث اور گلابی اردو کی شکل میں کتنی بھلی معلوم ہوتی ہیں۔ کیا نام کہ حاجی بلغ العلا کی گپ بازی ہمدرد کی جان تھی۔

اخباری دنیا میں سب سے سنجیدہ گپ باز رائٹر ایجنسی ہے جو نت نئی گپیں مشہور کرتی ہے۔ اسکے بعد پنجاب پریس جو آئے دن گپوں کے ذریعہ ہندو مسلم

جذبات کو مشتعل کرتا رہتا ہے۔

دکن میں بھی یہ مذاق قدیم سے ہے "چندر بدن و مہیار" والی گپ سب سے پہلے دکن ہی سے نکل کر ہندوستان میں پہونچی، میاں منصور کی انا الحق بھی یہیں کی پیداوار ہے، تغلق کے مظالم کی گپ بھی یہیں سے اڑی اور امیران صدہ نے یہیں بغاوت کی جسکی وجہ سلطنت بہمنیہ کی بنیا پڑی اور آخر میں انہیں گپوں نے اسے توڑ کر پانچ چھوٹی چھوٹی سلطنتیں قائم کیں تاناشاہ کے رنگ رلیاں بھی گپ تھیں عالمگیر کے طیش سے سنجیدہ صورت اختیار کرلیں۔ مہاراجہ چندولال کے زمانہ کی گپیں آپ نے سنی ہونگی۔

اب بھی بفضلہ تعالے دکن میں گپ باز موجود ہیں "مرزا الم نشرح" ایک فاضل گپی ہیں آپ کی دو گپیں مجلہ عثمانیہ کے پہلے اور دوسرے نمبروں میں بھی طبع ہو چکیں ہیں، تیسری گپ دہلی کے مشاعرہ کے عنوان سے اردو میں چھپا ہے اب تو ان گپوں کا مجموعہ "مضامین فرحت"[1] کے نام سے کراؤن مارک سیاہی میں چھپ چکا ہے جس پر ہمارے دوست کی ایک تاریخ بھی کندہ ہے، جنھوں نے "برس" کا قافیہ "ہنس" لکھا را یہ بھی ایک گپ ہے، اب ہمارا ارادہ بھی نظام گزٹ میں ایک مستقل سلسلہ گپ شروع کرنے کا ہے مگر یہ گپ کچھ زیادہ سنجیدہ نہ ہوگی یعنے ان گپوں سے فسادِ گلبرگہ کی طرح کوئی ہنگامہ نہ ہوگا، صرف تھوڑی دیر قہقہہ بازی اور پھر خاموشی، یہ صرف تمہید ہے آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا؟

---

[1] اب تو حصہ دوم بھی طبع ہوگیا۔

میر صاحب

یوں تو میر صاحب سے ہزاروں آدمی واقف ہیں، مگر ان کا نام شاید ہی
کسی کو معلوم ہو۔ میر صاحب ہر ایک کی زبان پر چڑھا ہوا ہے۔ کم از کم ہم نے تو انہیں
کسی دوسرے نام سے مخاطب کئے جاتے نہیں سنا۔ سبھی میر صاحب کہتے ہیں۔
میر صاحب کے قویٰ نہ جانے کیسے ہیں کہ نہ تو وہ گھٹتے ہیں نہ بڑھتے ہیں
وہی سفید مہرک کی شیروانی کپڑے کی گنڈیاں ٹکی ہوئی۔ مہرک کا پاجامہ ٹخنوں سے
اونچا۔ سفید ململ کا شملہ الٹا سیدھا لپٹا ہوا۔ کندھے پر صوفیانہ چرپالی رومال یا ڈنیں
مارکٹ کا غلغل لگا ہوا سرخ چرچاؤ۔ جیب میں سیاہ مقوے کی ناس کی ڈبیا۔ سیدھے
ہاتھ کی شہادت کی انگلی میں آخری چہار شنبہ کا چھلہ اور الٹے ہاتھ کی چھنگلیا میں مصر
شیرانی چھائے اور مونڈوں پر پان کے سرخ سرخ اور ناس کے سیاہ سیاہ
دھبوں سے مزین، اس حال میں ہم میر صاحب کو آج کل سے نہیں اٹھارہ انیس
سال سے دیکھ رہے ہیں۔ بھرا بھرا جسم متوسط قد سخت سخت ہاتھ پاؤں سر گھٹا

گھنی گردڈاڑھی جس میں بعض بعض سفید بال بھی ہیں، مونچھیں بالکل کتری ہوئی۔ کان پر لانبے لانبے بال، خط صاف بنا ہوا، ہاتھ میں "تنبیہ الغافلین" یعنے موٹا سا ڈنڈا جس کی شام لوہارسے ہر دوسرے مہینے میں بنوائی جاتی ہے۔

چونکہ میر صاحب ہمارے بزرگوں کے ملنے والے ہیں اسلئے ہم پر بہت مہربان رہتے ہیں واقعہ یہ ہے کہ ہمیں بھی پُرخلوص بزرگ والد مرحوم کے انتقال کی جب اطلاع ملی تو ہمیں ڈھونڈنا شروع کیا دو دفعہ گھر پر بھی آئے مگر ہم نہ تھے ایک دفعہ ہم گھر سے نکل ہی رہے تھے کہ حضرت ملگئے، بس لپٹ ہی تو گئے دیر تک والد مرحوم کو یاد کرکے روتے رہے اِدھر اُدھر کی باتیں کیں، سڑک پر کھڑے ہوئے نہایت ہی بے تکلفی سے گفتگو کرتے رہے ہم نے کہا "تقصیر چلیے، تھوڑی دیر تشریف تو رکھئے" میر صاحب تیار ہی تھے دیوان خانہ میں آکر بیٹھ گئے، ہماری ملازمت، منصب، والد کی علالت، موت، تجہیز و تکفین، بچوں کی تعلیم وغیرہ وغیرہ کے متعلق نہایت ہی سنجیدگی سے جرح کرتے رہے ہم نے اس غیر دلچسپ بحث کو ختم کرنے کیلئے حیدرآباد کے محرم کا لیے کا ذکر کر دیا، بس میر صاحب کی آنکھیں بھر آئیں ٹھنڈی سانس بھر کر کہنے لگے۔

"میاں[1] آج کل محرم میں رکھا ہی کیا ہے تم کو شاید آخری زمانہ کی کچھ باتیں

---

[1] میر صاحب کی زبان کے ذمہ دار ہم نہیں ہم نے نقل کی ہے۔ نمونے کے طور پر جو کچھ کہا ہم نے لکھ دیا تھا۔ اردو زبان وغیرہ کی نسبت اعتراض ہو تو گروہ صاحب کی گلی میں میر صاحب کو ڈھونڈ لیجئے گفتگو کر لیجئے۔ (مصنف)

یاد ہوں کیسی دلچسپی رہتی تھی کیا زمانہ تھا واللہ وہ دن یاد آتے ہیں تو کلیجے پر سانپ ہی تو لوٹ جاتا ہے، ہائے ادھر چاند نظر آیا اور ادھر علم استاد ہو گئے۔ گھر گھر علم گلی گلی الاوہ کوچہ کوچہ آبدار خانہ وہ چہل پہل وہ بھاگ دوڑ اب کہاں اللہ اللہ لنگر کے کیا کیا انتظامات ہوتے تھے مہینوں پہلے بنگلے کرایہ پر لیے جاتے فرش وغیرہ کا انتظام ہوتا۔ اور لوگ منہ اندھیرے آکر بیٹھ رہتے گیارہ بارہ بجے مثل لگتی رات کے (۱۲) بجے تک سلسلہ جاری رہتا خدا جنت نصیب فرمائے۔ حضور جنت آشیاں کو پنج محلہ پر رونق افروز رہتے کو قوالی کا باضابطہ انتظام رہتا تھا دُور دُور سے لوگ صرف لنگر دیکھنے آتے تھے۔ واللہ جب اکبر جنگ کوتوال کا ہاتھی سامنے سے گذرتا تو اچھے اچھے سورماؤں کے کپکپی پڑجاتی وہ گراں ڈیل کوہ پیکر ہاتھی وہ انکی خاص عماری اور اس پر اکبر جنگ کا خاص انداز میں بیٹھنا ہاتھی کے دو طرف دو جلاد کٹے (تیغے) ہاتھوں میں لئے سرخ سرخ آنکھیں چمکاتے ہوئے چلتے تھے آہ ایک سے ایک بارعب ایک سے ایک بانکا جوان مندوزی جمعدار بڑکمر والے برق جنگ، سلطان نواز جنگ، اور دوسرے بڑے بڑے جمعدار، کمندان، رئیس کیسی شان سے نکلتے وہ تمہارے محلہ والے نواب عباس علیخاں! ہائے لنگر کیا ہوتا تھا شہر کے بانکوں ترچھوں کی نمائش ہوتی تھی۔ نمائش اجی معمولی پیادوں میں تک ایک بانکپن تھا، اونچی چولی کا انگرکھا کمر بندھی ہوئی طپنچہ، کٹار، زیب کمر ہاتھ میں عباسی سر پر پگڑی جب

تنتے ہوئے چلتے تو زمین لرزنے لگتی زمین! اور پھر افسر سے لیکر سپاہی تک بات
بات پر کٹ مرنے تیار! ایک دفعہ سلطان نواز جنگ کا ہاتھی جس پر بچے سوار تھے
شاید روک دیا گیا یا واپس کر دیا گیا۔ بس غضب ہی تو ہو گیا۔ جمعدار نے جمعیت بنا
کرائی۔ اجی وہ خون خرابی ہوتی کہ سارا شہر لٹ جاتا مگر خدا جنت نصیب کرے مرحوم
سرکار نے روک دیا۔ تمہارے والد بھی تو اکثر سلطان نواز جنگ کے پاس رہتے تھے
ایک دفعہ وہ اور لڑکوں کے ساتھ ہاتھی پر نکلے۔ ظالم ایسا مست تھا کہ بس بگڑ کھڑا
ہوا چوک سے سیدھا نکلا تو پرانا پل پار ہو کر کاروان میں دم لیا۔ ہم بھی حسینی علم
کے پاس کھڑے تماشہ دیکھ رہے تھے خیر یہ ہوئی کہ فیلبان آدمی سمجھدار تھا آہستہ
آہستہ روک کر واپس لایا ورنہ غضب ہو جاتا۔ تمہارے والد پورا واقعہ تفصیل سے
بیان کرتے تھے۔ میاں اس زمانہ میں کیسے کیسے رنگ تھے یہ جو تم تھیٹر تھیٹر کرتے
رٹتے ہو۔ یہ اس کے سامنے کوئی چیز نہ تھی۔ نہ تھو بیگ کا رنگ، طیب علی کا رنگ
ان کا رنگ اُن کا رنگ کیسے کیسے استاد تھے، ہم نے الفریڈ کے ناٹک بھی دیکھے
اور رکھٹاؤ کے بھی۔ حج کو جاتے ہوئے بمبئی میں ہم نے تاقبل مسافر کا کھیل بھی دیکھا مگر
میاں! وہ بات کہاں ہائے ظالم غضب کرتے تھے غضب! کیسی کیسی نقلیں
اتارتے تھے کیسے کیسے سوانگ لاتے تھے وہ ناچنے والے وہ گانے والے! اب
کہاں اجی چوبیس چوبیس گھنٹے ایک ہی نقل ہوتی تھی بیچ محلہ مبارک پر حضور
رونق افروز رہتے نیچے رنگ ہوتا دو دو دن چار چار دن مسلسل ایک نکٹ کھڑا

رہتا۔ ہائے میں تم کو کس طرح سمجھاؤں تم نے آخری رنگ تو دیکھے ہیں، اُس وقت
وہ بات نہ تھی۔ کیسے دل چلے لوگ تھے۔ جس کو چاہتے بنا دیتے۔ جس کی چاہتے ہنسی
اڑاتے، محسن الملک، نذیر احمد، حسن بلگرامی تمہارے نانا یوسف الدین، مہدی بلگرامی
وغیرہ تک کو نہ چھوڑا۔ مولوی یوسف الدین اس زمانہ میں فراش مشہور ہو گئے تھے
ایک دفعہ سر بازار انکی نقل اتاری وہ بیٹھے دیکھا کئے دانت پیس کر رہ گئے،
کیا کرتے مجبور تھے۔ ان لوگوں کے ہاتھ سے کون بچا ہے جس کو چاہتے بدنام کر دیتے
گر بھی [illegible] لوگ! میاں! وہ دُلدل صاحب کی سواری کس دھوم سے نکلتی تھی
سارا [illegible] جاتا تھا جدھر دیکھو ٹوپیاں (مشعلیں) ہر طرف "وہ لہایا علی" کی
دھوم [illegible] جگہ جگہ ملتی تھی کھوے سے کھوا چھلتا ناک سے ناک رگڑے کھاتی
تھی، وہ دھوم دھام اب خواب و خیال ہی ہوگی۔ ندی کا میلہ شہادت کے روز
کیسے دھوم سے ہوتا تھا علم کا جلوس کتنا شاندار ہوتا تھا۔ بہشتی پانی چھڑکتے ہوئے
جاتے تھے، ملتی مشکیں چھڑولتے رہتے خوش اعتقاد سڑک پر عود گاڑھتے جاتے
سبیل ہر جگہ لگی رہتی پانی کے بجائے دودھ کے شربت پلائے جاتے، ہائے وہ
ماہی مراتب وہ علم مبارک کا ہاتھی آنسو بہاتے ہوئے گردن ڈالے کس غمگینی کیساتھ
چلتا تھا علم پر ڈھینوں کی کثرت، عود بتیوں، وغیرہ کی بوچھاڑ، بیچارہ علمبردار
ادھ موا ہی تو ہو جاتا کیسے کیسے تعزیے ساتھ ہوتے واللہ کس کمال سے بنائے
جاتے تھے۔ ندی پر دیکھنے کی دھوم ہوتی تھی، حضور پرانی حویلی پر سے ڈھٹی

مرحمت فرماتے تھے بعض دفعہ تو نذری پر بھی رونق افروز ہوجاتے تھے، نذری کا میلہ تو اب بھی ہوتا ہے۔ مگر وہ بات کہاں ؟

اُس زمانہ میں کیسے کیسے لوگ تھے سدّی مبروک استاد چنگاری، یاقوت عیسیٰ، ہنگش، کیسے کیسے پہنیت لکڑی باز تھے حضور تو مبروک کی پھیک پہروں ملاحظہ فرماتے، اشرفیوں کے توڑوں کے توڑے مرحمت فرماتے!

محرم کے سوانگ تو بس نام کو رہ گئے اب شیر تو نظر ہی نہیں آتے، کیسے کیسے جوان شیر بنتے تھے اچی چپل سیٹڈ (ناگ بچی) کی بھری بنڈی میں شیر سوتا ہوا جاتا تھا بعض شیروں کو تو ہم نے اپنی آنکھوں سے بکرے کا گلا چیر کر خون پیتے دیکھا ہے! وہ ہوا ہی بدل گئی، شیر ریچھ بندر ہرک، کتنے سوانگ ہوتے تھے وہ بے گنتی! بال والونکی پتلیاں، چھا بے کی پتیچے کی پتلیاں! بن صاحب کا آبدار خانہ حضرت عباس کی درگاہ، بی بی کا چدر، بادشاہی عاشور خانہ، حسینی علم، یہ دیکھنے کی چیزیں ہوتی تھیں، ہم لوگ دو دو تین تین رات تک ان مقامات کی سیر کرتے تھے، مگر جی نہ بھرتا تھا۔

مجلسیں کتنی دھوم سے ہوتی تھیں، رشید آتے تھے، دولہا آتے تھے میاں منجھو بھی رہتے وہ بھی کیا سماں تھا؟ سارے شہر میں لکڑیاں ٹولیاں تھیں ایک محلہ کی لکڑی دوسرے محلہ کے خلاف، وہ لکڑی چلتی وہ سر پھٹول ہوتا کہ الامان الحفیظ۔ خوب لکڑی چلتی تلوار تک نوبت پہونچتی، سال بھر کی عداوتیں

محرم میں نکل جاتی تھی، سینکڑوں مرتے ہزاروں ہاتھ پاؤں، آنکھ ناک کھو کر بُرے حالوں جیتے، بچوں میں تک یہ جذبہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ اپنے محلہ میں کوئی دوسرے محلہ کا لڑکا آ جاتا تو اس سے "نالہ بھرواتے"۔ میاں وہ باتیں خواب و خیال ہوگئیں، کسی نئے آدمی سے کہو تو سن کر ہنسے گا! نہ اب وہ جوش ہے اور نہ وہ دل وہ دماغ ہی نہیں وہ چونچلا ہی نہ رہا۔ دکھنی پٹھان مشہور تھے کیسے آن بان والے بات بات پر کٹ مرنے تیار، کوئی سامنے سے تنتا ہوا نکل تو جائے بس وہیں ڈھیر کر دیا۔ بڑے میر صاحب اپنی آنکھوں سے ملاحظہ فرما چکے تھے کہ ایک روز پانچ بجے ایک خان صاحب اپنے گھر کے بالاخانے پر بیٹھے ہوئے تھے سامنے سے ایک شامت زدہ مونچھیں چڑھاتا ہو گزرا بس خانصاحب آپے سے باہر ہو گئے تلوار سنبھال کر بالاخانے سے کود ہی تو پڑے اور پھر اس بانکے نوجوان کو مخاطب کرکے فرمایا میاں ہم بھی سپاہی ہیں۔ بنئے بقال نہیں تم نے کیا سمجھ کر ہمارے آگے مونچھیں چڑھائیں۔ وہ بیچارہ حیران ہو کر سب کچھ سنتا رہا آخر وہ بھی سپاہی تھا کہنے لگا۔ حضرت میں نے آپ کو دیکھ کر مونچھیں نہیں چڑھائی تھیں۔ مگر آپ کو ایسا ہی خیال ہے تو میں اب چڑھاتا ہوں آپ نے سمجھ کیا رکھا ہے۔ ہم بھی تو سپاہی ہیں کوئی چمار نہیں، بس خانصاحب کا بُرا حال ہو گیا۔ اس نوجوان کی گردن پکڑ کر ایسا جھنجھوڑا کہ دس ہی منٹ میں غریب کا دم نکل گیا آپ نے غریب کی نعش کو ٹھکرا کر فرمایا دیکھا مردوں کے آگے مونچھیں چڑھانے کا مزا۔

ایسے لوگ اب کہاں پیدا ہوتے ہیں انہیں کی نسل اب بھی باقی ہے مگر
پڑھ لکھکر سب بزدل ہو گئے ہاتھ اٹھاتے ہیں تو ضابطہ دیوانی کا خیال رکھ کر
پاؤں بڑھاتے ہیں تو فوجداری کے دفعات کو دیکھکر گھر سے نکلنے سے پہلے سوچ
لیتے ہیں کہ ان کا باہر نکلنا قابلِ دست اندازی پولس تو نہیں ؟ واقعہ یہ ہے کہ لکھنے
پڑھنے سے آدمی ناکارہ بزدل ضرور ہو جاتا ہے، یہی دیکھو نا تمہارے دادا ناظم
دیوانی بلدہ تھے انہیں حکم ہوا کہ امتحان دیں، یہ حکم بہت ناگوار گذرا کچھ سوچکر خاموش
ہو گئے چند روز کے بعد امتحان دیا اور کامیاب ہوے کامیابی کی اطلاع ملتے ہی
ستعفیٰ دیدیا فرماتے تھے کہ ہم نے عدالت کا کام کرتے کرتے عمر گذاری اب ہم سے
متحان کو کہا جا رہا ہے گویا ہم کچھ جانتے نہیں ہمارا ارادہ تو حکم ملتے ہی ملازمت
چھوڑ دینے کا تھا مگر یہ خیال ہوا کہ کہیں یہ نہ کہیں کہ امتحان میں ناکامیاب رہنے کے
وف سے ملازمت چھوڑ دی، ہم نے امتحان دیا اور پھر استعفیٰ"! اب دیکھو انہیں
واب سعادت علیخاں بہادر کے صاحبزادے تمہارے والد تھے انہوں نے کئی
یک امتحان دیئے جس کے باپ نے امتحان کو ذلت خیال کیا تھا، اس کا بیٹا
زت تصور کرنے لگا۔ اب تم ہو کہ تمہیں بھی امتحانوں کی دھن سوار ہے کہو تم لوگ
ڑھ کر بزدل ہو گئے یا نہیں، پرانے لوگ، قرآن شریف، چند حدیثیں چند تفسیریں
چھ منطق کی عربی کتابیں تھوڑی سی فارسی پڑھ لیتے تھے اور بس یہی وجہ تھی جو
ہ عزت، خودداری، وقار تمکنت، وضع داری پر جان تک دیدینے تیار ہوجاتے

تم لوگ فلسفہ سائنس، حساب، معاشیات، سیاسیات، الہیات، بلمیات، کیا اور کیا پڑھکر تمام چیزیں کھو بیٹھے ہو گالی سنتے ہو تو گالی کے فلسفہ پر بحث کرنے لگتے ہو عزت کا خیال نہیں کرتے، مار پڑتی ہے تو سائنس کے نقطۂ نظر سے اس کو دیکھتے ہو اسکی علتِ غائی سمجھنے لگتے ہو، خودداری کو نزدیک آنے نہیں دیتے۔

اسی طرح تم لوگوں نے ساری چیزوں کو بھلا دیا ہے، مذہب کا تو نام ہی نام رہ گیا۔ عید کی نماز بھی تمہیں ناگوار ہے، خدا کے احکام پر ہنسنا، رسول کے احکام کا مضحکہ اڑانا، آئمہ کے اقوال پر قہقہہ لگانا، بزرگوں کے افعال کو بے وقوفی ٹھہرانا تم لوگوں کی عادت ہو گئی ہے۔ لے دیکے تمہارے پاس مذہب صرف ترکی ٹوپی کی حد تک رہ گیا ہے وہ بھی جاڑے اور برسات میں کیونکہ گرمیوں میں تو تم لوگ کوٹ پتلون کے ساتھ دھوپ کی انگریزی ٹوپی استعمال کرتے ہو اس کے بعد البتہ بعض بعض وقت ترکی ٹوپی تم لوگوں کے سر پر نظر آتی ہے۔ ملک، قوم، وطن، جیسے ثقیل اور بے معنی الفاظ تم لوگوں کا تکیہ کلام ہیں، ملک کیلئے ایک پیسہ جیب سے نہ نکلیگا، قوم کیلئے گھر سے چار میل تک جانا نہ ہوگا۔ وطن کیلئے ہاتھ کٹوانے کے بھی روادار نہیں۔ مذہب سے اسقدر ہمدردی رہ گئی ہے کہ بس شریف گھرانے کی بیواؤں کا نکاح ثانی کرانے اور پردہ اٹھا کر لوگوں کی بہو بیٹیوں کو بے پردہ بنانے کی فکر میں رہتے ہو ہائے میاں برا نہ ماننا دل جلتا کلیجے میں آگ لگ جاتی ہے، خون کھولنے لگتا ہے، اُف زمانہ دیکھتے دیکھتے کیسا بدل گیا پہلے کے لوگ اپنے بزرگوں سے ملنے والوں یا اپنے سے بڑی عمر والوں کا

اتنا ادب کرتے تھے کہ ان کے آگے کھانستے کھنکارتے تک نہ تھے ہاتھ باندھے دو زانو مودب بیٹھا کرتے تھے اب تم ہی دیکھو میرے سامنے تم کسقدر بے تکلفی سے بیٹھے ہوئے ہو سگریٹ پر سگریٹ جلا رہے ہو ہائے ادب قاعدہ، تہذیب دنیا سے اٹھ گئی۔ اس کے بجائے بے حیائی کے پردے لوگوں کی آنکھوں پر پڑ گئے عبرت! عبرت!! ہم پرسوں شیخ جی کے پاس سکندر آباد چلے گئے ان کے بچوں نے کہا کہ آج ایک مشہور کھیل ہے ہم نے کہا جہاں اتنے شیطانی کھیل دیکھ چکے وہاں ایک اور سہی ہم بھی ان کے ساتھ وہاں کے فتح میدان میں پہنچ گئے، اتنی بھیڑ تھی کہ تل دھرنے جگہ نہ تھی ہم نے گھس پٹ کر آخر پہلی صف میں قدم گاڑ دیئے دیکھتے کیا ہیں کہ دو طرف تین تین پتلی پتلی کھونٹیاں تھوڑے تھوڑے فاصلہ پر لگی ہوئی ہیں ایک طرف سے ایک آدمی دوڑتا ہوا آکر ایک لکڑی کا چیتھڑا پھینکتا ہے اور دوسری طرف سے ایک چپو سے اس لکڑی کے گیند کو لوٹا دیتا ہے اور پھر بھاگ دوڑ شروع ہوتی ہے اِدھر سے اُدھر۔ اُدھر سے اِدھر دیوانے کی طرح دوڑتے ہیں جسے دیکھ کر لوگ چیختے چلاتے تالیاں پیٹتے۔ سیٹیاں بجاتے، ٹوپیاں اچھالتے ہیں یہ بھی کوئی کھیل ہے کھیل ہم نے بھی کھیلے ہیں مگر ایسے زنانی کھیل نہیں! کشتی کھیلی ہے، تلوار پھینکی ہے لکڑی چلائی ہے۔ ہم نے سب کچھ کیا ہے، ایک ہاتھ بلہ جیر کی بلہ۔ لونڈپاٹ، جھاڑ بندر، ستیجا۔ سبھی کھیلے ہیں وہ کیسے مردانہ کھیل ہوتے تھے۔ لونڈپاٹ میں ہمارے سامنے کوئی نہیں ٹھہرتا تھا، جھاڑ بندر میں

ہمارا مقابلہ کوئی نہ کرتا تھا۔ پتلے سے پتلے درخت کی چوٹی پر پہونچ جاتے تھے، سنجا ایسا کھیلا کہ سب لوگ مان گئے ابھی آدھ گھنٹہ پانی میں ڈوبے رہتے تھے کوئی تل میں چھپتا تو اسے بھی نکال لاتے تھے واللہ ہم نے کیا کیا نہیں کیا مگر ایسے زنانی کھیل ہم نے نہیں کھیلے! شطرنج، چوسر، پچیسی، ڈومنا، گنجفہ، تاش، داما، یہ سب کھیل ہم نے کھیلے ہیں تمہارے والد کے ماموں جیلانی صاحب مرحوم مشہور شطرنج کھیلنے والے تھے دالان میں بساط بچھی رہتی مخالف چال چلتا آپ اندر کمرے میں بیٹھ کر چال چلنے کہتے رہتے اور پھر تین چار چال میں مات ہو جاتی تھی ان سے بھی بازی دیتی ہے ایک نہیں کئی بار مات دی ہے۔ سید صاحب کی گلی میں ایک خاں صاحب رہتے تھے انکی پچیسی کی دھوم تھی ایک مرتبہ ہم نے ان سے بھی مقابلہ کیا اور جیتے بیچارے ہمیشہ ہمارے پاس آکر کھیلا کرتے تھے۔ بہرحال دنیا کا کوئی کھیل ہم سے چھوٹا نہیں! مگر یہ کھیل ایسے تھے کہ ان سے فائدہ بھی پہونچتا تھا ہماری جوانی کا زمانہ تھا شہر میں مشہور تھا کہ آصف نگر کے پہاڑوں میں کوئی بزرگ ٹھیرے ہوئے ہیں ایک دفعہ ہم بھی گئے اتفاق سے تنہا تھے، واپسی میں شام ہو گئی ابھی ہم نے پہاڑوں کا سلسلہ ختم بھی نہیں کیا کہ چار ڈھاٹا بند چور لاٹھی لکڑیاں لئے ہوئے آن پہونچے اتفاق دیکھئے کہ اس زمانہ میں ہم ہاتھ میں لکڑی بھی نہیں رکھتے تھے دیر تک سوچ کر کندھے سے رومال اتارا انگرکھے کے جیب سے چار موٹے شاہی پیسے نکال کر رومال کے ایک کونہ میں باندھ لئے اور رومال کو بل دیکر مقابلے

مقابلہ کیلئے تیار ہوگئے چار و ڈاکوؤں نے ہم پر حملہ کیا ہم نے رومال ہلانا شروع کیا پہلے ہی مار میں ایک چور کا گھٹنا بیکار کردیا وہ لنگا کر کر اہنے دوسرے مار میں دوسرے کے دونوں ہاتھ پہونچوں سے اتار دیئے وہ غریب تو فرار ہوگیا ایک کو ہم نے پیٹھ پر ایسی ضرب لگائی کہ زمین پر لوٹنے لگا چوتھے نے لکڑی پھینک کر ہمارے پاؤں پکڑ لئے کہنے لگا میر صاحب خدا کیلئے معاف فرمائیے ہم سے قصور ہو گیا ہم نے عاجز کو مارنا خلافِ انسانیت سمجھ کر اسے چھوڑ دیا اور اپنا راستہ لیا ہمکو اِن کھیلوں سے ایسے ایسے فائدے پہونچے یہ تمہارے زمانہ کے کھیل کیا فائدہ دیں گے ؟ ابھی ہم لکڑی لیکر کھڑے ہوجائیں تو سینکڑوں کو بھگا دیں، کھیل کے کھیل ہنر کے ہنر ہیں، پہلے شریفوں کو اس فن کی تعلیم دیجاتی تھی مگر ہائے اب تو شریفوں کی اولاد عورتوں کے ساتھ ٹینس کھیلتی ہے ٹینس!

وہ خاکی چڈّیاں (نکر) اور خاکی قمیص پہنے سر پر انگریزی ٹوپی اوڑھے مر میں رسی لٹکائے چھوٹے چھوٹے مدرسہ کے بچّے میلے ٹھیلے عرس جاترا میں اکثر ظر آتے ہیں۔ لوگ کہتے ہیں کہ یہ اسکاوٹ ہیں چاہے اسکاونٹ ہوں یا اسکے بونٹ ہوں مگر کس کام کے۔ سوائے پان چباتے ہوئے سگریٹ جلا کر تماش بینی رنے کے یہ لڑکے کر ہی کیا سکتے ہیں لعنبوا کے ہاتھ میں ان کے قد سے اونچا نس بھی ہوتا ہے۔ بیچارے "پتیرا" بدلنا تک جانتے نہیں بھلا لکڑی کیا چلائینگے؟ در پھر وہ بھی بانس، یہ لڑکوں کو آوارہ بنانے کی پہلی سیڑھی ہے وہ ندنیہ میلے

ٹھیلے میں جانے کی خوشی سے اجازت دیتے ہیں مدرسے سے رخصت ملجاتی ہے
نگرانی کرنیوالا کوئی ہوتا نہیں، جلو جو جی میں آیا کیا، کیا میاں اسی منہ پر تہذیب
سکھانے، مہذب بنانے کا وعدہ ہے۔ تہذیب اسی طرح سکھائی جاتی ہے اگلا
پچھلا حصہ کھلا ہے اور چلے جارہے ہیں۔ مٹکتے تھرکتے، گورا گورا رنگ بھرا بھرا
جسم، پھر چسپت لباس، سترِ عورت (گھٹنے) نظر آتے ہوئے انہیں دیکھکر بے تحاشا
جی میں آتا ہے کہ یہ کہدیں۔

اے تماشا گاہِ عالم روئے تو تو کجا بہر تماشا می روی

اور پھر دل لگی یہ کہ بیچارے دوسروں کی مدد کرنے یا دوسرے معنی میں خود تماشا
دیکھنے جاتے ہیں مگر واقعہ یہ ہے کہ بقول شخصے

تماشہ بن گئے خود ہی تماشا دیکھنے والے

وہ خود تماشا بن جاتے ہیں، یہیں سے ان کے اخلاق بگڑنے لگتے ہیں۔
علتِ مشائخاں پیدا ہونے لگتی ہے کیا جدید تہذیب اسی کا نام ہے پرانی روش
کو چھوڑ کر تم لوگوں نے جو ترقی کی وہ یہی ہے اپنی اولاد کو اسیطرح تربیت کرتے
ہیں؟ ہائے خدا کی قسم!

ترسم نہ رسی بہ کعبہ اے اعرابی کیں رہ کہ تو می روی بہ ترکستان است

لاحول ولا کدھر محرم کہاں وہ اکھاڑے اور کدھر یہ تمہاری جدید تہذیب
بیں بھی کہاں۔ سے کہاں پہونچ گیا بھائی بات یہ ہے افکار نے دماغ کو

ضعیف کر دیا ہے ایک وہ زمانہ تھا کہ ہمارے حافظہ کی دھوم تھی، کروڑوں
شعر یاد تھے۔ بیت بازی میں ہمارے آگے کوئی ٹھہر نہیں سکتا تھا ایسے شعر جنکے
آخر میں د، ڈ، ر، س، ش، وغیرہ ہوں ہمیں ہزاروں یاد تھے ذوق۔ سودا
میر، انشا، نصیر، مومن، کی غزلیں، نوکِ زباں تھیں ! بات یہ ہے کہ وہ صحبتیں
بھی ایسی ہی تھیں، غلام حسین داد مرحوم، کیفی مرحوم، تمہارے والد تجلی مرحوم
مست، میکش، تراب علی روز، استادِ داغ، ترکی وغیرہ کا مجمع تھا را تدن
انہیں لوگوں میں اٹھنا بیٹھنا تھا، مرحوم داد کی بذلہ سنجی، کیفی کی لطیفہ گوئی،
تجلی کی حاضر جوابی، مست کا چوچلا، میکش کی رندی، زور کی تاریخیں، استادِ
داغ کا روزمرہ، ترکی کا پھکڑ پن قابل دید تھا۔ ہائے کیا صحبت تھی، کیفی کا
یہ حال تھا کہ منٹ بھر نچلا نہ بیٹھا جاتا تھا، چلتے چلتے غزل کہدی بیٹھے
بیٹھے قصیدہ کھڈالا بڑے سے بڑے استاد کو مشاعرہ میں ٹوک دیا، آدمی کیا
فت تھا، معلومات کا یہ حال تھا کہ ایک دریا تھا دریا۔ تجلی، متانت، ثقاہت
سنجیدگی میں بالکل کیفی کا جواب تھا، کیفی رندانہ مزاج تو یہ صوفی منش مگر تھی
دنوں میں بڑی دوستی ! مست تو بس مست الست ہی تھا کیا کہوں کیسی طبیعت
پائی تھی دنیا بھر کی شرارتیں ظالم میں موجود ہر جھگڑے ہر فساد ہر بکھیڑے کا
بانی یہی ہوتا تھا چاہے وہ جو کچھ کر گذرے بھلا ہو یا برا یہ سب لوگ اس کا ساتھ
دیتے کیفی نے تو خصوصیت سے اس کا ساتھ دیا ہر معاملہ میں سینہ سپر نظر آتا تھا

بھائی دوست ہوں تو ایسے ہوں! واد کا کیا پوچھنا بلا کا پر گو غضب کا منسوڑ یہ دو دو پیسے والی چھوٹی چھوٹی نظموں کے چھپوانے کا طریقہ اسی ظالم نے رائج کیا عجیب آدمی تھا میکش ان سب کے پیرِ مغاں تھے مگر سب کے ساتھ بازور کی منہ زوری کیا کہوں کس کی مجال تھی کہ مشاعرے میں داد نہ دے! ابھی تاریخ گوئی میں کامل بلکہ اکمل تھا اب ایسا تاریخ گو کوئی نہیں رہا۔ استادِ داغ کا کیا پوچھنا بلبلِ ہندوستان تھا وہ روزمرہ، وہ سلامت، وہ زباں، وہ مضامین واقعہ یہ ہے کہ خدائے سخن تھا، اس پر سخنوری ختم ہوگئی، ترکی فارسی کا استاد تھا مگر اردو میں بھی کچھ کم نہ تھا کسی کو خاطر میں تھوڑا ہی لاتا تھا کہتا ہے ؎

اچھا ہوا کہ پہلے ہی مجھ سے گذر گئے — سعدی و انوری و دقیقی و رودکی
ورنہ دکھا کے رنگِ طرازِ سخن انہیں — کچھ ٹوٹی پھوٹی انکی بھی سن لیتا پارسی

ہر ایک اپنے اپنے وقت کا استاد تھا۔ اللہ اللہ کیسی صحبتیں تھیں، کیا زمانہ تھا یہ لوگ شاعر ہی نہیں تھے بلکہ شاعر گر بھی تھے انکی صحبت میں ہزاروں شاعر، ادیب عالم فاضل ہو گئے۔

تم صرف محرم کو یاد کرتے ہو اجی عرس میلے جھگڑے، مینا بازار، جاترا، بتن ہر چیز مستقل تھی، مولا کا عرس، بابا شرف الدین کا عرس، امام ضامن کا عرس، خواجہ کے چلہ کا عرس، تمام درگاہوں کے جھگڑے، الاوال، گشن باغ وغیرہ کی جاترا نواب حفیظ اللہ خاں کے پاس کا جشن، کیسی دلچسپیاں تھیں جھگڑوں میں کیسی

کیسی صورتیں نظر آتی تھیں، تمہارے والدِ مرحوم نے ایک جھگڑے ہی میں یہ
یہ مطلع سنایا تھا ؎

نظر پڑتی ہے جب میری کسی کی اچھی صورت پر
تو ہوتا ہوں میں صدقے صانعِ قدرت کی صنعت پر

شاید کیفی مرحوم نے بھی ؎

توڑے رے توڑے میرے پاؤں کے پائل توڑے

والی غزل جھگڑے ہی میں کہی تھی رسوا[1] صاحب کی مشہور "چولی کے بند" والی غزل بھی انہیں جھگڑوں کی یادگار ہے

ہولی دیوالی بھی خاص تھی اسوقت ہندوؤں اور مسلمانوں میں کس قدر اتفاق تھا دیوالی میں تمام ہندوؤں کی دوکانیں مسلمان دوستوں سے بھری رہتی تھیں ایک دوسرے سے کیسے برادرانہ طریقے سے ملتے۔ درد دکھ رنج و غم کے شریک تھے میاں ابتک بھی کچھ اتفاق حیدرآباد میں باقی ہے یہاں سے باہر جائیے تو معلوم ہوگا کہ ہندو مسلمان ایک دوسرے کے دشمن ہیں دشمن! خدا حیدرآباد میں اس اتحاد کو قائم رکھے۔

میر صاحب نے تہذیب و تمدن سیاست، مذہب غرض ہر چیز پر اظہار خیال فرمایا انکی تقریر اس قدر دلچسپ اور لچھے دار ہوتی ہے کہ ختم ہونیکا نام ہی

[1] حضرت مولوی میرزا غلام مصطفیٰ رسا

نہیں آتا۔ بہ وقت تمام ہم نے دوسری گفتگو چھیڑی۔ کچھ انکی صحت کے متعلق کچھ گھر کے متعلق کچھ بچوں کی مزاج پرسی مگر اس موضوع پر بھی ایک ایک مستقل لیکچر بڑی زور کا سنایا، آخر میں نلوں کے پانی کی وجہ ملیریا اور الکٹرک کی وجہ طاعون کے رہنے کا رونا بھی روتے رہے سلطان شاہی کے مکان کے آرایش بلدہ میں جانیکا ذکر کیا تو دیر تک اس محلہ کی ویرانی کا تذکرہ اور آرایش بلدہ کی ضرورت وغیرہ بیان فرمایا، بچوں پر تو بس برس ہی پڑے۔ نافرمانی، تعلیم سے عدم دلچسپی بے ادبی، گستاخی پر نہایت ہی فاضلانہ خیالات کا اظہار فرمایا اسی مصروفیت میں تین بجگئے۔ ہماری آنتیں قل ہو اللہ پڑھنے لگیں۔ جی تو چاہتا تھا کہ میر صاحب کے ساتھ کھانا کھائیں مگر پھر اس خوف سے کہ شام تک میر صاحب کی مسلسل تقریر کے مزے لینا پڑے گا ہم نے جمائیاں لینی شروع کیں بارے میر صاحب بھی کچھ سمجھ گئے اجازت چاہی تو بزرگوں کی روایت اور اپنی محبت کا اظہار فرماکر ملتے رہنے کی نصیحت اور گھر پر آنے کی ہدایت فرمائی اور ساڑھے تین بجے تشریف لیگئے۔

مولوی سردار علی صاحب نے مضمون کیلئے فرمایا تھا ہم نے دوسرے دن مضمون دینے کا وعدہ بھی کرلیا تھا میر صاحب سدّراہ نہ ہوتے ہم کتبخانہ آصفیہ پہنچکر کچھ میٹریل لا لیتے مگر انہوں نے نہ صرف وقت خراب کیا بلکہ دماغ کو بھی تقریباً ایک ہفتہ کیلئے رخصت اتفاقی دیدی ہم نے کہا کہ دوسرا کوئی

کام تو ہو نہیں سکتا میر صاحب کی ملاقات اور اُونکی گفتگو کا مختصر حال ہی لکھ لیں یہ ہے اس بکواس کی شانِ نزول! یہ صرف بکواس ہی بکواس نہیں ذرا غور کے قابل بھی چیز ہے۔

تا تو بیدار شوی نالہ کشیدم ورنہ
عشق کاریست کہ بے آہ وفغاں نیز کنند (اقبال)

اللہ بس



مرزا صاحب

مرزا صاحب خدا رکھے ہیں بڑے خلیق آدمی، بینائی میں فرق آ گیا ہے کان بھی جواب دے رہے ہیں۔ قوت بھی گھٹ گئی ہے مگر کیا مجال جو حضرت کے معمول میں فرق آئے وہی صبح دس بجے سے خانہ شماری شروع کی تو بس ایک بجا دیا اور پھر چھ بجے گھر سے نکلے تو واپسی کا نام نہیں، کبھی آٹھ نو بجے گھر لوٹے تو کبھی بارہ بجے اور کبھی رات بھر غائب، تمام شہر کی خاک چھان لینگے ہر ایک دوست سے ملیں گے امکانی ہمدردی کرینگے تب کہیں چین آتا ہے

دبلے پتلے تیر کی طرح سیدھے آدمی متوسط قد، گھٹا ہوا سر خشخاشی ڈاڑھی جس کے بال آدھے سے زیادہ سفید، بل کھائی ہوئی مونچھیں، سرمہ آلود آنکھیں سیاہ شملہ، باریک کپڑے کی ململی شیروانی، ہرک کا چست پاجامہ دلّی کا سادہ جوتا۔ ہاتھ میں پتلی سی بنوٹ کی لکڑی شام لگی ہوئی سیدھے ہاتھ کی انگلی میں آخری چہار شنبہ کا چھلّہ الٹے ہاتھ میں فیروزہ کی انگوٹھی اور مضراب، کندھے پر

رومال جیب میں پان کا بٹوا ایک تھیلی میں شطرنج کے مہرے اور کاغذ۔
رکابِ سعادت کے منصبدار سوائے دوست احباب کے اور کسی کی فکر
نہیں صبح ہوئی اور آپ اٹھ بیٹھے ضروریات سے فارغ ہوئے چاء پی اور
دیوان خانہ میں آ بیٹھے کوئی آ گیا تو بساط بچھ گئی ورنہ ستار بجانے لگے ساڑھے نو بجے
کھانا کھایا اور بٹوے میں پان بھر کر چلے، حضرت کے ملنے والے بھی خدا کے فضل
سے اکثر انہیں کے جیسے بے فکرے، کسی کے پاس تھوڑی دیر ستار بجاتے رہے،
کہیں ایک دو بازیاں شطرنج کی ہو گئیں، کسی جگہ گنجفہ اڑا، شطرنج کا شوق نہیں بلکہ
جنون ہے اب تو شاید کچھ کمی ہے مگر ایک زمانہ میں سنتے ہیں کہ "جنون" تھا اس
"جوشِ جنون" کا ایک واقعہ یہ بھی ہے کہ گھر پر میرزا صاحب کے کوئی عزیز بیمار تھے
اور برا حال تھا صبح صبح شیشہ لیکر نکلے حکیم صاحب سے ملاقات کی مریض کا حال کہا،
دوا لی اور واپس چلے، راستہ میں ایک دوست نے کہا کہ بھئی میرزا آؤ ایک بات
ہو جائے، بس میرزا صاحب بیٹھ گئے بازی لگ گئی مگر انہیں خبر نہ ہوئی ادھر قریب المرگ
بیمار نے تاب انتظار نہ لاکر داعی اجل کو لبیک بھی کہہ دیا۔ مگر میرزا صاحب کی بازی
ختم نہ ہوئی دوا لئے بیٹھے رہے ایک لڑکے نے آکر موت کی اطلاع دی اور میرزا صاحب
پریشان ہو کر اٹھ کھڑے ہوئے مگر مدمقابل کے یہ کہنے پر کہ میرزا مات ہماری تھی
تمہارا فرزین تو پھنس گیا، پھر بیٹھ گئے اور لگے کھیلنے ادھر لوگوں نے میت کی
تجہیز و تکفین کی اور عصر کی نماز کے وقت جنازہ مسجد کو پہنچا جب ایک شخص نے

میرزا صاحب کو اسکی اطلاع دی تو ادھوری بازی چھوڑ کر مجبوراً مسجد جا پہونچے۔
اس قصہ کی واقعیت میں شک نہیں اس لئے کہ جب کبھی ہم نے اس قصہ کے متعلق میرزا صاحب سے کچھ پوچھا تو انہوں نے "بھئی لوگ بات کا بتنگڑ بنا دیتے ہیں" کہکر خاموشی اختیار کی، اگر اصلیت نہ ہوتی تو وہ ضرور تردید کر دیتے۔
محرم کی دسویں تاریخ اتفاق سے میرزا صاحب مل گئے۔ سیاہ شیروانی گلے کی گنڈیاں کھلی ہوئیں، شملہ ندارد، کھلے سر، پاجامہ کے پائیچے چڑھے ہوئے برہنہ پا بغل میں سونے کے قبضہ کی عباسی (تلوار) سیدھے ہاتھ میں خاک شفا کی تسبیح، ہونٹ منہ خشک، چہرا اترا ہوا منہ میں پان نہ آنکھوں میں سرمہ، پہلے تو ہم میرزا صاحب کو دیکھ کر چکرائے مگر پھر شہادت کے روز کا خیال آ گیا تو ہم نے "جل تو جلال تو" کا ورد شروع کیا ڈرتا تھا کہ کہیں ہم کو ٹوپی اور جوتا پہنے ہوے دیکھ کر حضرت بگڑ نہ جائیں مگر خیر یہ گذری کہ صرف علیک سلیک پر بلا ٹلی البتہ جاتے جاتے میرزا صاحب نے پرسوں ذرا مل لینا، فرما دیا۔
میرزا صاحب کے بھکڑپن سے ہماری روح ہی فنا ہوتی ہے ہم نے سوچا کہ میرزا صاحب سے نہ ملیں تو پھر قیامت آجائیگی۔ راستہ میں جہاں کہیں ملاقات ہو گی حضرت لتے لے ڈالینگے وہ وہ بے نقط سنائینگے کہ توبہ، سنگ آمد و سخت آمد کہکر پہونچ ہی گئے میرزا صاحب دیوانخانے میں بیٹھے ایک صاحب کو ہوٹ کے کچھ زبانی گر بتا رہے تھے ایک شخص کو موجود پاکر مسرت ہوئی کہ چلو اسی غریب سے

میرزا صاحب کو جھک جھک کرنے دو ہم تھوڑی دیر بیٹھکر چلے آئینگے مگر ہمارا بیٹھنا ہی
تھا کہ میرزا صاحب نے اپنا لکچر ختم کر دیا اور متوجہ ہو گئے ہماری طرف، رسمی گفتگو
کے بعد ستار ہارمونیم کا موازنہ شروع کیا اور دیر تک اس پر روشنی ڈالتے رہے پھر
سُرود و فنٹل، سے لیکر مضمار، جلترنگ اور بانسری تک کے بجانے کے طریقے اور اس
فن شریف کے اساتذہ کے اسماء گرامی معہ مختصر حاشیہ کے سناتے رہے، وہ غریب
جو پہلے سے بیٹھا ہوا میرزا صاحب سے گفتگو کر رہا تھا یہ دیکھکر کہ میرزا صاحب ہم سے
نہایت ہی انہماک سے گفتگو کر رہے ہیں چلتا بنا۔ اب صرف ہیں ہم تھے دیر تک
یہی گفتگو ہوتی رہی، آخر ہم نے عرض کیا، قبلہ! ہمیں کیوں یاد فرمایا تھا کہنے لگے،

میاں بات دراصل یہ ہے کہ ہمارے ملنے والے سب مر مٹے، دیکھو نا کیفی
نہ رہے، ہست نے داروئے اجل پی لی، قطب الدین مدت ہوئی مر گئے، لے دیکے
ایک تمہارے والد رہ گئے تھے مگر آخر وقت میں انہوں نے بھی ہم سے کنارہ کرلیا
قبل از وقت داغ دیگئے، اب ایک نمک کی کنکری نجو میاں رہ گئے ہیں مگر ان کا
حال ہم سے برا ہے آنکھیں ہم سے زیادہ خراب ہو گئیں قوت تو بالکل نہ رہی گھٹنوں
کے درد نے بیچاروں کو معذور کر دیا ہم کو جب کبھی کسی معاملہ میں صلاح مشورہ کرنے
کی ضرورت ہوتی تو انہیں لوگوں سے رائے لیتے بھئی یہ لوگ تھے بھی بڑے قابل
بڑی دور اندیشی سے ہر ایک بات پر غور کر کے رائے دیتے ان لوگوں کا جانشیں
کوئی نہ رہا پرسوں تم نظر آئے تو ہم نے کہا چلو تمہیں سے کچھ مشورہ کرلیں بات

در اصل یہ ہے کہ خدا سلامت رکھے حضور کو ہماری آسایش کا ہر طرح سے انتظام فرمارہے ہیں دیکھو نا یہ آئے دن کے "طاعون" اور انفلوئنزا "(انفلوئنزا) میعادی بخار وغیرہ میں ہم لوگوں کو مبتلا دیکھ کر حضور نے پختہ موریاں بنوانے کا حکم صادر فرمادیا محلّے وسیع ہو رہے ہیں جگہ جگہ چمن بندی ہو رہی ہے سرکاری مکانات بن رہے ہیں دوکانوں کیلئے سائباں تیار ہو رہے ہیں۔ دیکھو کیا کچھ نہیں ہو رہا ہے یہی حیدرآباد جو آج کل دُلہن کی طرح سجا سجایا نظر آرہا ہے آج سے بیس اکیس سال پہلے بالکل برباد ہو چکا تھا ویران تھا جگہ جگہ مٹی کے ڈھیر خاک کے تودے بڑے بڑے غار نظر آتے تھے یہ کاہے کے تھے معلوم ہے؟ اجی اس منحوس ندی کی طغیانی کے غضب خدا کا آدھا شہر اُجڑ گیا تھا میاں تم چھوٹے تھے پانچ سات برس کی عمر ہوگی تمہیں تفصیل کیا معلوم ہم نے آنکھوں سے دیکھا ہے آہ یوں تو شہر میں کئی وقت طغیانیاں آئیں مرزا صاحب مرحوم فرمایا کرتے تھے کہ ۱۶۳۱ء میں سلطان عبداللہ قطب شاہ کے زمانہ میں سب سے پہلی طغیانی آئی تھی بیچ شہر تک پانی آگیا تھا اس کے بعد ۱۷۶۸ء میں نواب میر نظام علیخاں کے زمانے میں بھی طغیانی ہوئی مگر ایسا زیادہ نقصان نہیں ہوا نواب ناصر الدولہ کے زمانہ میں ۱۸۳۱ء کا سیلاب خود بڑے میرزا صاحب نے دیکھا تھا وہ فرماتے تھے کہ وہ بھی عظیم الشان طغیانی تھی۔ گھانسی میاں کا بازار۔ سدی عنبر کا بازار بہہ گیا تھا ۱۹۰۳ء کی طغیانی ہم نے بھی دیکھی ہے اسوقت ہم جوان تھے مگر یہ کوئی بڑی طغیانی نہ تھی معمولی تھی قیامت تو بس

سنہ ۱۹۰۸ء میں آئی وسط رمضان شریف تک حیدرآباد میں بارش نہ ہوئی تھی،
لوگ چاہتے تھے کہ پانی برسے ۲۲ اور ۲۴ شعبان سے یکایک پانی برسنے لگا چند
دنوں تک تو یونہی معمولی بارش ہوتی رہی مگر بعد میں زور بڑھ گیا غضب خدا کا
۲۶ گھنٹوں میں ۱۶ انچ بارش ہو گئی اس کثرت سے پانی پڑا کہ جل تھل ہو گیا ندی
تالاب ایک ہو گئے ۲۸ شعبان کی رات کو یکایک پانی بڑھ گیا اور آبادی میں
گھسنے لگا صبح تک مستعد پورہ، بیگم بازار، گھانسی میاں کا بازار امین باغ تمام پانی
میں چھپ گئے تھے دوپہر تک کاروان، دھول پیٹ، افضل گنج، بازار سدی عنبر
فیل خانہ، توپ خانہ، گوشہ محل، گول بنگلہ، گولی گوڑہ، پتلیوں کی باؤلی، سید
محی الدین پاشا کا باغ، جام باغ، کاچی گوڑہ بھی تہ آب تھا اور زور بڑھتا جارہا
تھا تھوڑی دیر کے بعد کشن باغ، بہادر پورہ، چیلکنی پورہ، کبوتر خانہ، محبوب پورہ
مہندی، اردو، چار محل، دار الشفا، عثمان پورہ بھی پانی میں تیرتا نظر آرہا تھا،
وہ عمارتیں جو تا قیامت پائدار سمجھی جارہی تھیں حباب کی طرح بہ گئیں، بڑے بڑے
درخت جڑ سے اکھڑ گئے، غضب خدا کا تھا وجیہا عظیم الشان ہاتھی اجی ہاتھی
کیا پہاڑ سمجھو تنکے کی طرح بہ گیا، پرانا پل، مسلم پل، افضل گنج کا پل، چادر گھاٹ
کا پل سبھی کاڑیوں کی ڈبیوں کی طرح بہ گئے افضل گنج کا دواخانہ بیماروں سمیت
بہ گیا، عدالت العالیہ کی بنیاد ہل گئی۔ ٹھگی جیل کی اینٹ سے اینٹ بج گئی۔ زچگی خانہ
وکٹوریہ زنانہ ہاسپٹل معہ زچاؤں اور بچوں کے نہ جانے کس طرف بہ گیا فیاض علیخاں

کی کوٹھی کا پتہ بھی نہ رہا۔ وہ رسی ڈلنی کے اول مددگار کا بنگلہ ایسے بھنور میں آیا کہ پتہ نہ لگا۔ افضل گنج کا انگریزی ٹپہ خانہ رسی ڈلنی کا تار گھر بھی ڈہ گیا، اجی ایک دو ہو تو کہتے جائیں ندی کے دو طرفہ فقط خاک کا ڈھیر تھا یا بڑے بڑے غار اور کچھ نہیں سارا کاروان موسیٰ ندی کے قافلہ کے ساتھ جا چکا تھا محلہ کا پتہ نہ تھا، کوکہ کی ٹٹی معلوم نہیں کہ ہوا سے اڑی یا پانی سے بہی مگر نام و نشان تک باقی نہ تھا دھول پیٹھ میں واقعی دھول اڑ رہی تھی، پٹیلہ برج ساقط ہو چکا تھا کولسہ واڑی کی آگ ہمیشہ کیلئے بجھ چکی تھی، چنیا دروازہ پانی کے ڈنڈے سے گلی کی طرح اڑ چکا تھا گگل گوڑے کے باشندے بوکھلائے ہوئے اپنا گھر ڈھونڈھتے پھر رہے تھے مگر کوئی نشان باقی نہ تھا۔ چادر گھاٹ بھی نیست و نابود ہو چکا تھا، طغیانی کیا تھی خدا کا غضب تھا غضب قیامت تھی اُف منزائے اعمال کہوا ور کیا تھا ہائے کیسے کیسے گھر تباہ ہوگئے وہ امیر جو ہاتھی اور میانہ کے بغیر ڈیوڑھی سے نہ نکلے تھے تنہا بہ تقدیر سر پہ ٹوپی نہ پاؤں میں جوتا بھاگا بھاگ اپنی جان بچا رہے تھے وہ خواتین جن کو کسی غیر محرم نے خواب میں بھی نہ دیکھا تھا جو کبھی چوکھٹ سے باہر نہ ہوئی تھیں بغیر چادر کے چلی جا رہی تھیں آہ ماں بچے کو چھوڑ شوہر بیوی کو چھوڑ بیٹا ماں سے بچھڑ کر بیوی شوہر سے جدا ہو کر اپنی اپنی جان بچا رہے تھے ہائے کیا قیامت تھی بدنصیبوں نے اس پُر آشوب وقت میں بھی اپنی عادت نہیں چھوڑی چوریاں کیں، بدفعلیاں کیں بدمعاشیاں کیں۔ خدا سمجھے جو نہ کرنا کیا تھا آہ کیا وقت تھا

مرحوم سرکار کو خدا وندِ عالم کروٹ کروٹ جنت دے وہ انتظام کیا کہ واہ
طغیانی کے روز سرکار پرانی حویلی میں رونق افروز تھے پانی جب بڑھنے لگا تو خانہ
زادوں نے فلک نما پر تشریف لے چلنے کیلئے عرض کیا مگر سرکار کو اپنی عزیز رعایا
کی تکلیف کا اس قدر احساس تھا کہ فرطِ رقت سے چشم پُر آب ہو کر انکار فرما دیے
تھے منٹ منٹ کی کیفیت سماعت فرماتے رہے طوفان فرو کرنیکی امکانی
تدابیر اختیار فرمائیں مگر وہ کوئی حادثہ ہوتا تو رُکتا وہ تو ہم لوگوں کے اعمال
کی سزا تھی۔ مگر حضور بے انتہا بے چین تھے صبح کو نواب افسر الملک کو طلب فرمایا وہ
اپنی راحت منزل میں تھے مگر میاں سپاہی ہو تو ایسا ہو مالک کا حکم ملتے ہی
گھوڑے پر چڑھ کر چلے تینوں پل ٹوٹ چکے تھے چادر گھاٹ کا پل لرز رہا تھا
گھٹنوں برابر پانی اوپر بہ رہا تھا مگر افسر الملک بہادر نے گھوڑا ڈال ہی تو دیا
آہ وہ پانی کیا تھا بلا تھی ہائے گہرے سرخ رنگ کا سیاہی مائل پانی اسمیں
بُو اس غضب کی تھی کہ ناک نہ دی جاتی تھی اس پانی میں گھوڑا ابھی قدم دھرنے
کا روادار نہ تھا مگر مالک کے حکم سے وہ بھی مجبور ہو گیا نواب صاحب نے
گھوڑے کو رانوں میں مسل کر کوڑا کیا تو غریب تلملا کر چل پڑا جب بیچ پل پر پہنچا
تو تنگ تک بھیگ رہا تھا آخر وقت میں غریب نے تیر کر راستہ طے کیا اور
ادھر نواب صاحب پل سے اُترے اور ادھر ایک دھماکا ہوا اور دھڑام سے
پل گرا میاں سپاہی ایسے ہوتے ہیں اور مالک کے حکم پر اسطرح جان لڑاتے

تیار ہو جاتے ہیں۔

جب حضور اعلیٰ حضرت نے مجبور کیا تو سرکار موٹر میں سوار ہو کر با دیدۂ پُرآب قصر فلک نما رونق افروز ہوئے مگر اسقدر متاثر تھے کہ دو روز تک خاصہ تناول نہ فرمایا گھڑی گھڑی پل پل کی کیفیت دریافت فرماتے رہے افسر الملک بہادر کو مصیبت زدوں کی امداد کیلئے روانہ فرمایا، دوسری رمضان کو مہاراجہ بہادر کے نام حکم صادر فرمایا کہ پلوں کی فوری تعمیر کیجائے اور رعایا کی دلدہی کیجائے، حویلی قدیم اور رنبیج محلہ کو کھولنے کا حکم صادر فرمایا اور مصیبت زدوں کو ٹھیرا کر انکی خورونوش اور آسایش کا انتظام کرنے کا حکم مرحمت فرمایا شہر کے اندر اور باہر ہر جگہ سرکاری طور پر مصیبت زدہ ہندوؤں [illegible] کو کھانا ملنے لگا مہاراجہ بہادر نے بھی بے انتہا مستعدی اور ہمدردی [illegible] خلق اللہ کی مدد کی ہر طرح آسایش بہم پہنچائی ۵ رمضان کو حضور [illegible] نے ایک فرمان کے ذریعہ ان خدمات پر اظہار خوشنودی فرمایا سنٹرل ریلیف کمیٹی اور والنٹیروں نے جو کام کیا اس پر ۲۷ شوال کے فرمان مبارک میں اپنی خوشنودی کا اظہار فرمایا مکانات اور گلی کوچوں میں دبی ہوئی لاشوں کو نکلوا کر دفنانے میں ریلیف کمیٹی، فوج باقاعدہ، صفائی ملدہ اور کوتوالی نے بڑی محنت کی لاشوں میں اس قدر عفونت پیدا ہو گئی تھی کہ سامنے جایا نہیں جاتا تھا اور پھر نہ جلنے پانی میں کونسا تیزاب تھا کہ تمام نعشیں گل گئی تھیں۔

دس لنگر خانے سرکار نے قائم فرمائے تھے پانچ ہندوؤں اور پانچ مسلمانوں کیلئے مولوی ظفر علیخاں[1] نے افضل گنج کے لنگر خانے کا نہایت عمدہ انتظام کیا، روزانہ پچاس ہزار آدمی ان لنگر خانوں سے کھانا کھاتے تھے چودہ پندرہ دن تک یہ لنگر خانے قائم رہے کل چھ لاکھ سے زیادہ آدمیوں نے اس سے فائدہ اٹھایا سینتیس ہزار آٹھ سو ترانوے روپیے صرف ہوے ان کے علاوہ چار لنگر خانے سرکار نے جیب خاص سے مقرر فرمائے تھے جو بہت دنوں تک قائم رہے مہاراجہ بہادر نے مصیبت زدوں کیلئے چندو لعل کی بارہ دری کھلوادی تھی سرکار نے اسد باغ کی اجازت مرحمت فرمادی تھی، فتح میدان لال ٹیکری خیریت آباد میں ڈیرے اور جھونپڑیاں بھی ڈلوادی گئی تھیں!

مہاراجہ بہادر نے جریدۂ غیر معمولی کے ذریعہ ۲۳ آبان سے ۲ آذر ۱۳۱۸ف تک دفاتر بلدہ کو عام تعطیل اور تمام ملازمین کو ایک مہینہ کی تنخواہ پیشگی دینے کا حکم صادر فرمادیا۔ اور بعد میں ان ملازمین کی یہ پیشگی الایصال شدہ تنخواہ معاف کردی گئی جو (۵۰) سے کم پاتے تھے۔

انجمن خواتین نے بھی مصیبت زدوں کی بہت امداد کی سرکار سے تیس ہزار روپیے امداد کیلئے مرحمت ہوئے تھے جنکی ساڑیاں، شطرنجیاں رضائیاں کمبلیں وغیرہ تقسیم کی گئیں!

طغیانی کیا تھی؟ آہ، تقریباً ۱۵ محلے بالکل ویران ہوگئے۔ انیس ہزار مکانات تباہ ہوئے ایک لاکھ آدمی بے خانماں ہوئے اور ان میں سے آدھے سے زیادہ بذا۔ حل

[1] آقا ظفر علیخاں آف زمیندار

ہوے اس مصیبت پر ہندوستان ہی نہیں بلکہ دنیا کے گوشے گوشے سے آنسوؤں کے
تار بندھ گئے ملک معظم نے وائسرائے نے شہزادہ ویلز نے، گورنر بمبئی نے، مدرستہ العلوم
علیگڈھ نے ندوۃ العلما لکھنو نے ہمدردی کے تار دیئے لندن میں گویا صاحب سید امیر علی
صاحب گوکھلے، علی اکبر لطیفی صاحب وغیرہ نے مل کر شریف لندن (لارڈ میئر) کے
زیر صدارت ایک جلسہ کیا اور دس ہزار روپیہ چندہ جمع کیا شہزادہ ویلز نے بھی دو ہزار
روپیہ مرحمت فرمایا حیدرآباد و سکندرآباد میں بھی بڑے بڑے جلسے ہوے اور چندہ جمع
کرکے مصیبت زدوں کی مدد کیگئی اب کس کو پوری تفصیل یاد ہے تفصیل دیکھنے کا شوق ہے تو
رسالہ ادیب حیدرآباد کا طوفان نمبر دیکھو جسے مولوی سید خورشید علی صاحب نے مرتب کیا ہے[1]

آہ ایسی ویرانی تھی کہ وہ میاں غالب نے دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا" کہا ہے اگر وہ منظر
دیکھتے تو گھر کا تصور بھی نہ کرتے واللہ ایک ویرانی تھی جسکو حقیقی معنوں میں ویرانی کہہ سکتے ہیں

ایسے تباہ شدہ شہر کو پھر دلہن کی طرح آراستہ کرنا ہمارے مالک حضور پر نور ہی کا
کام تھا بھلا اب کوئی کہہ بھی سکتا ہے کہ کبھی یہاں ندی بھی آئی تھی طغیانی بھی ہوئی تھی
طوفان بھی اوٹھا تھا تالاب بنا کر ندی کا زور ہمیشہ کیلئے توڑ دیا۔ رہی بانس نہ بجی بانسری
چلو اب ندی ہی نہ رہی تو طغیانی کہاں سے آئیگی اسطرح ندی کی فکر سے تو نجات ملی اب
یہ محلے کھلے اور ہموار ہوجائینگے اور پختہ موریاں بن جائینگی تو ملیریا طاعون بھی دفع ہوجائینگے
خداوند عالم حضور کو سلامت رکھے ہماری آسایش کیلئے کس قدر انتظام فرمایا ہے"۔

"لے لاحول ولا میں کہاں سے کہاں پہنچ گیا ہاں ہوئی بات یہ ہے کہ آرائش بلدہ

---

[1] مولنا سید خورشید علی صاحب ظلہ ناظم دفتر دیوانی و مال و ملکی و مناصب خطابات و مواہیر و استیفاد وغیرہ آنریری سکریٹری حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس و بیت المعذورین وغیرہ۔

نے میرے گھر کا ایک کونا سڑک کی تعمیر کیلئے لینے کا ارادہ کیا ہے پرسوں ہی پیمائش ہوئی ہے اور مجھ سے پوچھا جا رہا ہے کہ میں صرف اتنا کونا دینے تیار ہوں یا پورا مکان دینا چاہتا ہوں کہو کیا کروں اسی معاملہ میں تم سے رائے لینی تھی اور اسی لئے میں نے تمہیں ملنے کیلئے کہا تھا میاں اب ہمارے ملنے والے ہیں کون جن سے کچھ پوچھیں سب مرکھپ گئے جو لوگ ہیں وہ ایسے معاملوں سے بے خبر ستار طبلہ سارنگی، بنوٹ کشتی پیرا کی مرغ بازی شطرنج سنار کی باتیں پوچھو تو کہیں گے مگر یہ نفع و نقصان کی چیزیں انکی سمجھ میں نہیں آتیں تم لوگ البتہ خوب سمجھتے ہو آخر مدرسہ میں تمہیں سب کچھ سکھلایا گیا ہے تم نے سود در سود کا حساب تو کیا ہوگا نا؟ کٹ متی پلٹ سود بھی سیکھے ہونگے وہ لوگ یہ چیزیں لیا جائیں ؟"

ہم نے اپنا ناقص خیال ظاہر کیا دیر تک رد و قدح ہوتی رہی آخر کسی قدر ترمیم کے ساتھ ہمارا مشورہ خلعت قبول سے سرفراز ہوا ہم نے کہا کہ چلو بھر پایا مگر وہ جانے بھی تو دیں! ماما کو آواز دیکر روٹ اور چنگے منگوا لئے اور ہمیں زبردستی کھلایا دم کے روٹ تھے بڑے لذیذ۔ روٹ کھا کر ہم نے اجازت چاہی تو روک کر بساط بچھا دی کہنے لگے آؤ ایک بازی کھیل لیں ہم ہار کر ٹائی کے عادی چند مہرے کھپا کر فرزین مار لیا اور قلعہ توڑ کر مات دیدی مگر مرزا صاحب کھیل کے رسیا اب کہیں مل لے تو کیسے ایک بازی اور کھیلی اور مات لیکر اٹھنا چاہا مگر واپسی اتنی آسان نہ تھی جتنی کہ ہم سمجھے ہوئے تھے مرزا صاحب نے طاعون اور ملیریا کے متعلق اپنے معلومات کا اظہار فرمانا شروع کیا

چوہوں کی پیدائش۔ جراثیم کی آمد۔ گلٹی اور اُسکی حقیقت۔ آسان ترین علاج پہلے
پلیگ کا مختصر حال اور شہر والوں کی بدحواسی انفلوئنزا اور ملیریا کا فرق دونوں کے وجوہات
طریق علاج پر ایسا ڈاکٹرانہ خطبہ ارشاد فرمایا کہ ہم نے انکی طبابت کا بھی لوہا مان لیا۔
پلیگ کی گلٹی پر بھلاواں کوٹ کر لگانا اور مریض کو مٹی کا تیل پلانا، دیکھئے کس قدر
آسان نسخہ ہے اسی طرح انفلوئنزا کیلئے "ستِ گل بیل" کی چھ آنے والی شیشی کا
ایک ہفتہ استعمال اور ملیریا کیلئے مکہ مسجد کے سامنے کے تنبولی کے پاس کا پان کا
بیڑا (جس کے متعلق مشہور ہے کہ مکھی مار کر پان میں ڈالکر بیڑا بنا دیا جاتا ہے) کسقدر
آسان اور عمدہ نسخے ہیں کاش یہ چیزیں مرزا صاحب کسی ڈاکٹر سے فرماتے ہائے
ہوئے ڈاکٹر لاری ورنہ لوٹ ہی تو جاتے!

اس قدر معلومات سے بہرہ اندوز ہونیکے بعد ہمارے دماغ کو بدہضمی ہونے لگی
جماہیوں پر جماہیاں آنے لگیں۔ آنکھیں الگ بند ہو رہی تھیں۔ سگریٹ کئی گھنٹوں
سے نہ پینے کی وجہ پیٹ میں بھی درد ہونے لگا ہم نے بکمال لجاجت واپسی کی
اجازت چاہی اور مرزا صاحب نے بکمال سرفرازی اجازت دیدی۔ جی تو چاہتا
ہے کہ حضرت کی شان میں کم از کم ایک قصیدہ لکھا جائے اور پھر اس خیال سے
کہ پُرانی وضع کے ہیں لوگ ان کو کچھ نہ کہو خاموشی اختیار کرنی پڑتی ہے۔

مولوی جی

ہمارے مُولوی جی مدرسے کے معلّم یا مسجد کے پیش امام نہیں۔ اور نہ مُولوی اصغر کے خاندان کے رکُن ہیں۔ مگر اِن سب باتوں کے باوجود مُولوی اور صرف مولوی ہیں۔

والد بزرگوار مُولوی جی کے متعلق فرماتے تھے۔ کہ مُولوی جی کے والد گڑ اکو کی دوکان کرتے تھے۔ انکی دوکان کا خمیرہ سارے شہر میں مشہور تھا۔ مُولوی جی کی ابتدائی تعلیم محلہ کی مسجد میں ہوئی۔ بغدادی قاعدہ ختم کر کے کلام اللہ کی تعلیم پائی۔ اور پھر آمدنامہ۔ کریما۔ ماقیماں۔ رقعات عنایت علی وغیرہ وغیرہ۔ اُسی مسجد کے ملّاں جی یا میاں جی سے ختم کیں۔ اور چنچلگوڑہ کے مشہور عامل حضرت ہدایت علی صاحب مرحوم سے۔ نجوم۔ جفر۔ رمل۔ تعویذ فلیتہ۔ گنڈا۔ جھنتر منتر وغیرہ کی سند لی۔ سُنا ہے کہ مشہور بنّوٹ باز استاد ننگش سے بنّوٹ۔ روز لکڑی بھی سیکھی۔ مگر پیترے برابر نہ پڑتے تھے۔ مجبوراً ترک کر دیا۔ مگر

اپنے تئیں ہمیشہ بڑے تلوارئے پھیکیت، ہنوٹے سمجھا کئے۔ مولوی نادرالزماں مرحوم کے حلقۂ درس میں مدتوں شرکت کی۔ پڑھا تو کچھ بھی نہیں۔ صرف سنا کرتے تھے حضرت فیض اور حضرت مکیش کے مشاعرے میں سب سے پہلے موجود رہتے تھے محرم کے زمانہ میں نتھو بیگ اور نصراللہ کے رنگ کی سیر بھی کر لیتے۔ باپ کے مرنے پر دوکان سنبھالی مگر قدرت نے انہیں مولویانہ دماغ دیا تھا۔ بیوپار کیلئے کسی طرح موزوں ثابت نہ ہوئے۔ دوسرے ہی سال دیوالہ پٹ گیا۔ اور مولوی جی بیک بینی و دو گوش دوکان سے نکلے۔ یہ مختصر سوانح تھی جو والد مغفور نے ایک دفعہ ہم سے بیان فرمایا تھا!

ہم اپنے بچپن سے مولوی جی کو ایک حالت پر دیکھ رہے ہیں والد مغفور کے پاس ہمیشہ تشریف لاتے تھے۔ ٹخنوں سے اونچا شرعی پاجامہ۔ پاؤں میں مارکٹ کا کھیتلا جوتا۔ گھٹنوں سے نیچا لانبا کرتا۔ اندر کھدر کی موٹی نیم آستین ڈھیلا ڈھالا لمل کا شاہا سر پر سفید بہ مقدار علم شملہ، کندھے پر چرپالی صوفیانہ رومال آنکھوں میں دنبالہ دار سرمہ۔ ڈاڑھی حنیلی کے تیل سے لپی ہوئی دانت کثرت پان خوری سے لال مگر ہونٹ بالکل سفید۔

منشی قمرالدین صاحب اور نتھو چچا مولوی جی کو بے طرح ستاتے مگر وہ بگڑتے بہت کم تھے۔ ہمیشہ ہنس کر ٹال جاتے۔ ایک دفعہ ان حضرات نے پان میں مسی ڈال کر دیدیا۔ مولوی گلوری چبا گئے۔ مگر انہیں گھر جانے کے بعد معلوم ہوا کہ

ہونٹوں پر دھری جگمگی ہر۔ بہت بگڑے کئی دن تک اُن لوگوں سے گفتگو نہ کی مگر یہ حضرات چوکنے والے تھوڑے ہی تھے۔ خوشامد کر کے منا ہی لیا۔

آخری چہار شنبہ اس زمانہ میں خاص اہتمام سے منایا جاتا تھا۔ یارانِ بے تکلف میر عالم کے تالاب پر پہنچ گئے۔ اور ڈھونڈ ڈھانڈ کر مولوی جی کو بھی ساتھ لے لیا۔ بارہ بجے کھانا کھا کر لوگوں کو تیراکی سوجھی سبھوں نے شریفانہ لباس اتار کر لنگوٹ۔ جانگیا۔ رومال باندھ لیا اور لگے تیرنے مولوی جی تیرنا جانتے نہ تھے۔ نجو چچا نے پانچ منٹ میں تیرنا سکھانے کا وعدہ کر کے مولوی جی کے کپڑے اتروا دیے اور رومال بندھوا کر تالاب میں ڈھکیل ہی تو دیا۔ بیچارے غوطے کھاتے رہے بڑی دیر کے بعد اُنہیں سنبھالا۔ اور کنارے چھوڑ گئے۔ مولوی جی چونکہ تھک گئے تھے۔ اس لئے دیر تک تالاب کے کنارے لیٹے رہے۔ سبھوں نے تیرنا ختم کیا اور کپڑے پہن کر مختلف کھیلوں میں مصروف ہو گئے۔ کسی طرف شطرنج ہونے لگی کوئی پچیسی لے بیٹھا۔ کہیں پر تاش اڑنے لگا۔ کسی نے ڈومنا (ترکی گنجفہ) شروع کیا، بھلا اب مولوی جی سے نچلا بیٹھا جاتا تھا۔ لیٹے لیٹے اُٹھ کھڑے ہوئے کونا کونا دیکھ ڈالا۔ ہر جگہ ڈھونڈا مگر کپڑے ندارد۔ بھیگا رومال باندھے ہوئے سب لوگوں کے بیچ میں آ گئے اور لگے عربی آمیز اردو میں رجز خوانی کرنے کبھی اکی تان منشی قمر الدین صاحب پر ٹوٹتی اور کبھی نجو چچا پر۔ بہر حال ایک گھنٹہ تک مولوی جی نے مسلسل فصاحت و بلاغت کے دریا "لبِ تالاب کے کنارے"!

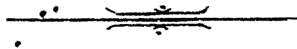
بہائے۔ تب کہیں محبوب بیگ صاحب نے انہیں پتہ دیا کہ کپڑے گٹھری کی شکل میں برگد کے درخت پر لگے ہوئے ہیں۔ مشکل یہ تھی کہ مولوی جی درخت پر بھی نہیں چڑھ سکتے تھے۔ بیچارے سیّد نے اِن کو کپڑے نکال دیئے۔ مولوی جی نے سیّد کو دعا اور سبھوں کو گالیاں دیتے ہوئے نیم آستین۔ کرتا سا پہن لیا۔ اب جو پیجامہ پہنتے ہیں تو کلیاں ہیں نہ رومالی۔ صرف پائنچے اور نیفہ۔ بس آگ ہی تو ہو گئے۔ وہ وہ محاورے سنانے لگے کہ شاید ہی کسی نے ایسی تقریر کبھی سنی ہوگی۔ دیر تک خطبہ دیتے رہے۔ مگر جب سیّد نے نخوّ چچا کے آگے مٹھائی کی کشتی اور چائے کا سٹ لگا دیا تو آپ بھی عمامہ باندھتے ہوئے پہنچ گئے۔ ایک بالائی کی پوری۔ دو تین گلاب جامن اور تقریباً پاؤ بھر برفی کھا کر ایک لب بند۔ لب سوز۔ لب ریز پیالی خالی کردی۔ تب کہیں چین آیا۔ تھوڑی دیر کے بعد مولوی جی خوش تھے۔ نہ تو ڈوبنے کا ملال تھا نہ پاجامے کا رنج۔ مجسم زندہ دلی تھے۔

والدِ مرحوم جب تک شہر میں تھے مولوی جی برابر آتے رہے جب وہ باہر گئے تو مولوی جی نے آنا جانا ترک کر دیا۔ کبھی کبھار راستہ میں مِل جاتے تو پُرخلوص علیک سلیک ضرور ہو جاتی تھی۔ والدِ مرحوم کے انتقال کے بعد ایک دفعہ غریب خانہ پر تشریف لائے نہایت خلوص سے پُرسا دیا خود بھی روئے ہمیں بھی رُلایا اور چلتے بنے۔

رمضان کی عید کے دوسرے روز ٹھیک ڈیرہ بجے چلچلاتی دھوپ
میں ہم جارہے تھے لطیف الدین صاحب کے پاس اتفاقاً دبیر پورہ میں
حضرت نے دیکھ لیا۔ اور لگے گلا پھاڑ پھاڑ کر چیخنے اجی میاں، او عابد میاں
بھئی تمکین، اجی کاظمی صاحب، او حضرت، بھلا ہماری کیا مجال تھی جو آگے
بڑھتے۔ سائیکل روک لیا۔ اور حضرت سے مخاطب ہوگئے۔ عید کی مبارکباد
نمازِ عید کا تذکرہ۔ روزوں کے متعلق استفسار اور گرمی کا دکھڑا ایک ہی سانس
میں سب کچھ سنا دیا۔ ہم تو پسینے میں نہا گئے۔ نئی شیروانی بھیگ گئی۔ ہم نے
کہا تقصیر معاف ہیں بخارِ کہنہ ہے دھوپ میں تکلیف ہوتی ہے۔ بس ہمارا ہاتھ
تھام کر گلی کا رخ کیا۔ ایک پست سفال پوش مکان کی کنڈی کھٹکھٹائی اور
کواڑ کھلنے پر خود اندر تشریف لے گئے۔ چار منٹ کے بعد نہایت ہی قرأت
کے ساتھ اندر تشریف لائیے کی تلاوت فرمانے لگے۔ ہم نے بصد مشکل دو تین جا
پھٹے ہوئے ٹاٹ کے پردے میں الجھ کر اپنے آپ کو مع سائیکل دروازے کے اندر
پہنچا دیا۔ ایک مختصر حجرے میں جس میں ایک پھٹا ہوا بوریا اور اسکے اوپر پرانی
شطرنجی بچھی ہوئی تھی۔ جس پر ایک سوزنی یا چاندنی ایسی بچھی ہوتی تھی جس کا
کوئی مستقل رنگ شاید ہی کبھی ہو۔ حجرہ بلا مبالغہ چھ فٹ مربع اور اسی قدر اونچا
ہوگا۔ ہم نے ایک کونے میں ڈیرہ ڈال دیا۔ مولوی جی صدر میں متمکن ہوگئے
اور لگے زمزمہ سرائی کرنے خواجہ حسن نظامی اور مولانا محمد علی کی لڑائی۔ ابن سعود کے

اعتقادات، حکیم اجمل خاں مرحوم کی خدمات۔ مولوی شبیر احمد کے وعظ۔ ترکوں کی معاشرت۔ امیر کابل کی سیاحت۔ ملکہ کابل کی بے پردگی۔ غرض دنیا کی کوئی چیز ایسی نہ بچی جس کا تذکرہ مولوی جی نے نہ فرمایا ہو۔ اور پھر اس پر اپنے خیال کا اظہار نہ کیا ہو۔ اخیر میں اگلی صحبتیں یاد آ گئیں۔ کہنے لگے میاں وہ بھی کیا زمانہ تھا۔ خدا غریق رحمت کرے تمہارے والد بخو میاں منشی قمرالدین ستّار خاں۔ عبداللہ خاں۔ مولوی اسمٰعیل غوثو میاں کیسے کیسے لوگ تھے کچھ تو مر گئے اور جو باقی ہیں وہ قبر میں پاؤں لٹکائے ہوئے بیٹھے ہیں۔ نہ فراغت ہے نہ اطمینان۔ نہ زندہ دلی ہے نہ چہل۔ دل ہی تو بجھ گئے۔ وہ آخری چہار شنبہ کے جلسے۔ وہ مولا کا عرس۔ وہ لنگم پلی کا میلا۔ وہ عرسوں کے جھگڑے وہ محرم کے رنگ۔ وہ نویں کی رات کو الاؤں کی زیارت وہ سرکاری لنگر ہائے۔ اللہ کیا زمانہ تھا۔ اجی ہم کس عرس میں نہ جاتے تھے۔ کون سے میلے میں شریک نہ ہوتے تھے۔ کونسی محفل چھوٹتی تھی۔ ہائے ہائے کیا پاکیزہ صحبت تھی۔ رند بنے تو پکے رند۔ کوئی عرس۔ کوئی میلا۔ کوئی جھگڑا نہ چھوٹا۔ سبھی عالم فاضل تھے۔ کیسے کیسے مباحثے ہوتے۔ جالنالم سے بحثیں ہوتیں۔ عبدالحی وحاجی کسے مناظرہ ہوتا تو ترکی سے فارسی میں جھڑپ ہوتی تو بائبل سے اردو میں۔ خدا مغفرت کرے قطب میاں اجی وہی کیفی تو غضب تھا غضب کسی کو پڑھنے نہ دیتا غلام حسین داغ ۔ عبدالحی باغ۔ سورج بھان۔ مسکین۔ ثاقب۔ کیفی۔ ناظم۔ تجلی۔ تشنہ۔ تسلی

شوق کیسے کیسے شاعر تھے۔ مشاعرہ انہیں کی وجہ سے ہوتا تھا۔ ہائے سب کے سب مر گئے۔ معلوم نہیں مولوی جی یاران رفتہ پر کب تک ماتم کرتے خیر یہ گذری کہ ہمیں مارے گرمی کے شدید درد سر ہونے لگا اور ہم معافی مانگ کر بھاگ کھڑے ہوئے اور ان کے گھر سے نکل کر سیدھے حسین ساگر کے کٹے پر جا کر دم لیا۔



منشی جی

منشی جی کی ہستی علمی دنیا کیلئے بہت مفید اور کاروباری دنیا کیلئے بے انتہا ضروری ہے۔ یہ منشی جی کسی گورے کو نہیں پڑھاتے۔ کسی دفتر میں کام نہیں کرتے۔ کسی دوکان سے تعلق نہیں رکھتے۔ کسی شخصیت کے محتاج نہیں۔" اپنے قلم سے آپ روزی کماتے ہیں۔ خود کھاتے ہیں۔ اوروں کو کھلاتے ہیں۔" غالب نے انہیں کیلئے کہا تھا ؎

کوئی لکھوائے اُنکو خط تو آکر ہم سے لکھوائے
ہوئی صبح اور رکھ کر کان کے اُوپر قلم نکلے

منشی جی خدا کے فضل سے وقت کے بہت پابند ہیں۔ صبح ½ ۵ بجے خواب راحت سے بیدار ہوتے ہیں۔ اگر جیب میں زیادہ "زیر گاری" ہو (جسکو منشی جی اپنی اصطلاح میں "خُردہ" کہتے ہیں) تو گھر سے سیدھے "مغل ہوٹل" کو چلے اور "نہاری کلچوں" کا ناشتہ اڑایا ایک لب بند لب زیر۔ بالائی آمیز

ٹھنڈی سانس لیکر جیب سے رقعات عنایت علی نکالا۔ اس پر کچھ کاغذ رکھکر ایک کونے پر رکھدیا۔ اور اوس کے اوپر قدرتی پیپر ویٹ اس کے جواب میں دوات اور جیب میں کا "بروکا قلم" اور "چاقو" بیچ میں کندھے سے رومال اتار کر رکھ چھوڑا اور لگے مراقبہ کرنے!

منشی جی ہمارے قدیم کرمفرما ہیں جس زمانہ میں کہ ہم ابتدائی تعلیمی مراحل "دھرم ونت اسکول" میں طے کر رہے تھے ہمیں گھر سے ایک کاپی دیجاتی تھی جس پر کلاس ماسٹر کے دستخط بقید تاریخ و وقت حاضری لینے کا حکم تھا۔ ابتدا میں تو ہمنے ماسٹر صاحب کے دستخط لئے۔ مگر تا بہ کے۔ آخر روز کی حاضری اور پھر وقت کی پابندی کس سے ہوئی ہے جو ہم سے ہوتی محرم کے پہلے ہفتہ میں ہم ایک روز بجائے اسکول کے "نھتو بیگ" کے رنگ میں حاضر رہے۔ مگر واپسی پر کاپی کے معرا ہونے کے خیال نے بیچین کر دیا۔ اتفاقاً منشی جی کا خیال آگیا۔ ہم جلدی سے جا پہنچے۔ تاریخ وقت لکھوالیا۔ اور اُن کے دستخط بھی کرائے۔ گھر پر کہدیا کہ استاد بدل گئے ہیں۔ یہ نئے استاد کے دستخط ہیں۔ چلو چھٹی ہوئی۔ خدا سلامت رکھے منشی جی کو انھوں ایک مہینہ تک برابر دستخط کئے۔ مگر ہماری قسمت کو کیا کرتے گھر پر اطلاع پہنچی اور ہم پٹے۔ خیر یہ تو ایک جملہ معترضہ تھا۔ مگر منشی جی ہمارے پرانے شناسا تھے۔ جس زمانہ میں کہ ہم منشی جی سے ملتے تھے اُن کا روزگار خوب چلتا تھا

دفاتر کے رسائل۔ درخواستیں۔ عرضیاں۔ خطوط۔ منی آڈر فارم۔ اسم نویسی، غرض کے سینکڑوں چیزیں اِن سے لکھوائی جاتی تھیں۔ حیدرآباد میں تعلیم کا چرچا کم تھا خوش قلم عرضیاں، خوشخط درخواستیں، ٹائپ اور ترجمہ کے سائن بورڈ کہیں تھے ہی نہیں۔ مطبعے بھی اس کثرت سے نہ تھے۔ اور نہ وہاں کچّا خط لکھنے والے کاتب ہی تھے۔ دفاتر میں امیدواروں۔ عرائض نویسوں کی یہ کثرت نہ تھی۔ جو کچھ تھے یہی منشی صاحبان تھے جو چار مینار کے چاروں طرف دوزانو بیٹھے ہوئے تھے قلم دبائے ہوئے

پرسوں ہم "شاہ علی بنڈہ" کی طرف جارہے تھے مگر سرکار کی سواری شاید آنے والی تھی۔ روک ٹوک کی وجہ سے ہم نے تھوڑی دیر چار مینار کے گرد چکّر کاٹنا مناسب خیال کیا۔ پہلے تو حقیر فقیر پر تقصیر یہاں نہیں۔ بلکہ محمد منیر مرزا کی دنداں ساز کی دکان اور چند ہوٹلوں کے بیرونی حصوں کا معائنہ کیا پھر ذرا آگے بڑھ کر چار مینار کی خاص علامت "بلّی کے سر" پر غور کیا۔ اس کے بعد جو اِدھر اُدھر نظر ڈالی تو منشی جی کو بھی اسی پرانی جگہ بیٹھے ہوئے بوریہ پر مصروفِ مراقبہ پایا۔ ہم نے کہا چلو انہیں سے گفتگو کریں۔ دیر تک پاؤں پٹکنے اور آواز دینے کے بعد منشی جی مراقبہ سے چونکے۔ نیم باز آنکھوں سے سرسری ملاحظہ فرمایا۔ اور پھر منہ ہی منہ میں کچھ کہتے ہوئے مراقب ہوگئے ہم نے جو زور زور سے سائیکل کی گھنٹی بجائی تب کہیں انہوں نے سر اٹھایا اور آنکھیں چار کیں۔ کہنے لگے میاں!

مگر لب سوز نہیں برف انگیز چائے کی پیالی پی لی۔ اور آٹھ پیسے کی "افیون" گھلا گھلا کر کھائی۔ اور پھر چلے۔ اس وقت منشی جی نظام الملک طوسی یا ابوالفضل فیضی سے کم نظر نہیں آتے۔ ہزاروں شعر نوکِ زبان گلستاں بوستاں۔ کریما۔ مامقیماں کے شعر۔ آمدن نامہ کی گردانیں منہ ہی منہ میں دہراتے ہوئے جاتے ہیں۔ مگر یہ سب "عاشور خانہ" تک وہاں پہنچتے ہی سب رفو چکر۔ صرف ایک شعر بلکہ بعض وقت ایک ہی مصرع

بہ تمنائے گوشت مرد ن بہ

حافظہ میں محفوظ رہ جاتا ہے۔ مگر یہی سے قصائی کو گھورتے ہوئے دکان تک پہنچ جاتے ہیں۔ آئندہ کا وعدہ۔ منحوس طاعون کا تذکرہ۔ اپنے محلہ کی حالت نہاری کی بدمزگی۔ بکلچوں میں گھی کی کمی۔ چارہ کی خرابی۔ دودھ اور شکر کی کمی بارش کی قلت۔ چارہ کا عنقا ہونا۔ بکروں کی گرانی۔ مگر باوجود اسکے مخاطب کا عمدہ بکرے لانا اور ارزاں گوشت فروخت کرنا۔ یہ تمام باتیں وقتِ واحد میں نہایت ہی چرب زبانی بلکہ شیوہ بیانی کے ساتھ کہجاتی ہیں "بڑے صاحب" اپنے مال کی تعریف اور پھر گرانی کے باوجود ارزاں فروخت کرنے کا حال سنکر پھول ہی تو جاتے ہیں۔ اِدھر اُدھر گھور کر دیکھا۔ ذرا مونچھوں کو کھڑا کیا اور پھر پوچھا "منشی صاحب پسندے دون یا قیمہ" منشی جی نے وقار آمیز متانت کے ساتھ قیمہ مانگا۔ اور ایک پتّے میں پاؤ بھر قیمہ۔ بلّی کیلئے چند

ہڈیاں۔ کچھ چھچھڑے لیکر چلے" کمیلے کی مسجد" کے ہاں سے ادرک لہسن گرم مصالحہ دال۔ نمک۔ پودینہ۔ کوتمر۔ زیرہ۔ لوجوار۔ امچور۔ اور چھوٹے چھوٹے بینگن لیکر ٹھیک سات بجے گھر پر موجود۔

اور پھر دس منٹ کے بعد منشی جی ایک قلم کان پر ایک جیب میں رکھے۔ مٹی کی دوات ہاتھ میں لئے چند میلے کاغذوں کو بغل میں دابے کونے کونے "رولر سگریٹ" کی خالی ڈبیاں ڈھونڈھتے ہوئے اڈے کو چلے پہلے توصفائی کی امین کچہری کے شیڈ میں سے ٹوٹی ہوئی جھاڑو لی اور اپنے اڈے کو جھاڑا اور پھر اُسے رکھکر پھٹی ہوئی شطرنجی جو دو فٹ مربع ہوگی ذرا جھٹکی گئی اور اس سے کسی قدر بوسیدہ بوریہ کا ٹکڑا لیکر اڈے کو سنوارا۔ اِدھر اُدھر سے دو چار پتھر ارے لاحول ولا پیپر ویٹ لیکر بیچ میں رکھدیا خود چار مینار کے کٹہرے[1] کو ٹیکا دیکر بیٹھ گئے پہلے ایک نظر دونوں طرف ڈالی "وزیر علی بادشاہ" کی ڈیوڑھی کے دروازے کو گھورا۔ "علی میاں" کے چائے خانہ کو للچائی نظروں سے دیکھا۔ اور پھر ایک لمبی نظر میداں خاں کے چوک کانٹے جعفر علی کے تابوت۔ بلکہ مال والوں کی ڈیوڑھی تک ڈالی۔ ایک

---

[1] اللہ بخشے ظالم آرائش بلدہ والوں کو انہوں نے یہ کٹہرا اکھیڑ کر پھینک دیا اور اب منشی جی کی پیٹھ کا یہ سہارا جاتا رہا۔

زن مُرید

جہاں تک میں نے سنجیدگی سے غور کیا "زن مریدوں" کے اقسام حسب ذیل پائے گئے۔

(۱) اپنی فطری کمزوریوں کی وجہ سے بیوی سے خوف زدہ رہنے والے

(۲) بیوی کے تمول یا اسکے والدین کے اثرات سے ڈرنے والے۔

(۳) بیوی کی خوبصورتی سے متاثر ہو کر دبے رہنے والے۔

(۴) بیوی کی ضد، غصّہ، ہٹ، یا تعلیم کی وجہ سے محکوم رہنے والے۔

(۵) خواہ مخواہ بلا کسی وجہ کے سہم جانیوالے۔

پہلے زمرے میں وہ لوگ شریک ہیں جو یا تو دائم المریض ہوں یا بقول بعض اشتہاری دوا فروشوں کے بچپن کی غلط کاریوں کی وجہ لطف زندگی کھو بیٹھے ہوں۔

دوسرے وہ جو "گھر داماد" ہوں یا بیوی کے روپئے پر گذر بسر کرتے ہوں

یا اوس کے والدین وغیرہ سے سفارش وغیرہ کی امید رکھتے ہوں۔

تیسرے وہ ہیں جو رفیق زندگی کی خوبصورتی پر بے طرح مرمٹے ہوں۔

چوتھے وہ گربہ یا گاؤ صفت بزرگ جو نہایت غریب، سادہ لوح، قدیم الخیال، کم تعلیم یافتہ غیر مستقل مزاج ہوں۔

پانچویں وہ حضرات جو مذکورۂ بالا چاروں طبقوں سے بھی تعلق نہ رکھتے ہوں مگر فطرتاً "پاپوش کاری" کیلئے بنائے گئے ہوں۔

میں ایک مدت سے اس پر غور کر رہا ہوں مگر اب تک کوئی بات سمجھ میں نہیں آئی اور نہ امید ہے کہ کبھی سمجھ میں آئے گی۔ میں نے اکثر اصحاب کی طرز معاشرت پر غور کیا ہے بعض لوگوں کے حالات کسی قدر دلچسپ ہیں ممکن ہے کہ ان کو سنکر بعض احباب کوئی مستقل خیال قائم کر سکیں۔

میرے ایک ملاقاتی بہت مسن ہیں سن شریف دو بیس (۴۰) سے زیادہ ہے مگر ابھی تک بکمال انکسار اپنے آپکو کم از کم جوان تصور فرماتے ہیں دو نیک بختوں کو میر مومن کے دائرہ میں سلا چکے ہیں۔ اب تیسری کے دام زلف میں اسیر ہیں مگر اس بری طرح پھنسے ہیں کہ کچھ کہا نہیں جاتا۔ بیوی سے اس قدر ڈرتے ہیں جس قدر کہ ایک بغدادی قاعدہ پڑھنے والا لڑکا اپنے میانجی یا اس مسجد کے ملا کی چھڑی سے ڈرتا ہو جہاں کہ وہ پڑھنے جایا کرتا ہے۔ یہ پہلے زمرے سے متعلق ہیں اور صرف یہی ایک ہیں جو اس معزز طبقہ کے افراد میں سے میرے ملاقاتی ہیں

آپ ہیں؟ میں سمجھا کوئی حضرت چھیڑنے کیلئے آگئے ہونگے۔ آجکل نوجوانوں نے
بہت ستانا شروع کر دیا ہے۔ میں نے کہا منشی جی اب کیا حال ہے۔ کچھ ملتا
بھی ہے یا دن بھر اونگا ہی کرتے ہو۔ کہنے لگے "میاں کیا کہوں کوڑی کا کام
نہیں ہوتا۔ سامنے محلّات کا دفتر تھا۔ وہ اب پنچ محل کے پاس چلے گیا۔ پڑھنے
لکھنے والے بہت ہو گئے۔ خدا بھلا کرے ان انگریزوں کا انہوں نے ٹائپ
نکال دیا۔ ٹائپ، اس سے تو ہم بے موت مر گئے۔ یہ پڑھے لکھے بچّے مڈل
میٹرک پاس کر کے دکانوں پر بیٹھ گئے۔ آپ دیکھتے ہونگے نا۔ ایک صاحب نے
"ٹائپ اور ترجمہ کیا جاتا ہے" لکھ کر تختی ہی لگا دی ایک نے معجز رقم لکھکر لگا دیا
سب لوگ خوش قلم عرضیاں لکھنے لگے۔ مطبعے بہت ہو گئے۔ کاتب بھی اب
کاپی نویسی چھوڑ کر درخواست نویسی پر اتر آئے۔ بچہ بچہ لکھنے لگا۔ سب تو
سب غضب خدا کا یہ ہے کہ عورتیں لکھنے پڑھنے لگی ہیں۔ کل کی بچّیاں
خط لکھ لیتی ہیں۔ پہلے کے طریقے ہی نہ رہے۔ اسم نویسی مٹ گئی۔ اقرار
نامے تمسک نہ رہے۔ دیکھئے تو اب سفید کاغذ پر دولہا کا نام اس کے
باپ دادا ماں اور نانی کے نام اردو میں لکھ کر بھیجنے لگے۔ نہ وہ عبارت
آرائی رہی نہ وہ خاص سُرخ سُرخ کاغذ رہا۔ نہ وہ خاص مضمون ہی رہا
اب کی اسم نویسیاں دیکھئے نہ تو "بسم اللہ" نہ "بحمدہٖ الصّفی" غضب یہ کہ پہلے تو
اسمائے مستورات در پردۂ عصمت لکھ کر چھوڑ دیتے تھے۔ اب کے لوگ

پردے کی بیٹھنے والیوں کے نام تک لکھنے لگے۔ اللہ اللہ کیا زمانہ بدل گیا۔ پہلے اسم نویسوں میں لکھا جاتا تھا کہ "ہر جا کہ خواہند دریافت فرمایند" اب سرے سے کچھ لکھا ہی نہیں جاتا۔ اجی دعوت کے رقعے دیکھئے سر نہ ٹانگ "لطیف الدین ادریسی متمنّی ہے کہ شرکت عقد و تناول طعام سے ممنون فرمائیں۔" ایک کونہ پر وقت۔ ایک جگہ مقام۔ بس رقعہ ختم۔ آپ ہی کہئے یہ کوئی دعوت کا رقعہ ہے۔ آیت نہ حدیث۔ قافیہ نہ ردیف۔ چار انگل کے ادّدے پیلے کارڈ پر بھونڈا مضمون چھاپ دیا۔ خطوں کو دیکھئے "مکرمی" "مشفقی" "محبی" تو اب ذرا معمر اور پرانے خیال کے لوگ لکھتے ہیں نوجواں تو بس "ڈیر" لکھکر چلے گھانس کترتے ہوئے۔ خط کیا لکھ رہے ہیں گویا پنچنامہ کر رہے ہیں۔ لاحول ولا اب کہئے ہم جیسے بوڑھوں سے کون لکھوائے گا ہمارا پیٹ کیا چلیگا اب شریفوں سے تو ہم ہاتھ دھو بیٹھے۔ بیچارے غریب مزدور، پان سگریٹ والے کبھی کبھار خط کارڈ لکھوا لیتے ہیں اور دو پیسے ہم کو ملجاتے ہیں اگر یہ نہوتے تو ہم کبھی کے مکہ مسجد کی سیڑھیوں کے پاس بیٹھے بھیک مانگتے نظر آتے یہ کہکر منشی جی آبدیدہ ہوگئے۔ چھوٹی چھوٹی آنکھیں بھر آئیں۔ پچکے ہوئے گال پھول گئے۔ ہاتھ میں رعشہ زیادہ ہوگیا۔ بہ ہزار دقت پھٹا ہوا رومال زانو کے نیچے سے نکالکر آنسو پونچھے اور ایک سرد آہ کھینچکر کہا "میاں ہم زندگی کے دن پورے کر رہے ہیں۔ مگر برے حالوں۔"

دوسرے طبقہ کے اکثر بزرگوں سے واقف ہوں۔ ایک بزرگوار ماموں زاد ایسوسی ایشن کے ممبر یعنی اپنی ماموں زاد بہن کے شوہر ہیں۔ بدقسمتی سے بچپن ہی میں یتیم ہوگئے تھے۔ ماموں ہی نے پڑھایا لکھایا اور نوکر رکھا دیا ان حضرت کی وقعت اپنی بیوی کے پاس وہی ہے جو ایک تانگہ والے کی پولیس کانسٹیبل کے پاس ہوتی ہے۔ بی۔ ایس۔ سی۔ ہیں مگر بیوی سے اسقدر مرعوب کہ اگر وہ ہلدی کی گرہ کو "ہڈروفلورک ایسڈ" کہدے تو یہ معمل میں جاکر ثابت کرنے کو تیار ہوجائیں گے کہ واقعی ہلدی "ہڈروفلورک" ہے اور ایک صاحب جو اسی زمرے سے متعلق ہیں۔ اس ایسوسی ایشن کے ممبر تو نہیں مگر اپنے خسر کے تمول کی وجہ سے اس قدر مرعوب رہتے ہیں کہ ان کے ملازمین نے کلکتہ کے گلشن سلیپر سے انکی چندیا کے بال نکلتے دیکھا ہے۔

تیسرے طبقہ کے لوگ اکثر ملتے ہیں۔ ایک میرے عزیز بلائے حسن میں اس قدر مبتلا ہوئے کہ چوتھی چالوں کے اندر ہی اندر ماں بھائی بہن سب کو چھوڑ چھاڑ کر نیک بخت کے ساتھ علیحدہ جاکر رہ گئے۔

اور ایک کرمفرما نے اپنے شوق ذوق کو محض اس لئے ترک کردیا کہ انکی صاحبِ جمال رفیقۂ زندگی کی فرمائشات کی تکمیل کیلئے روپیہ کافی نہ تھا۔ اب وہ بجائے سینما دیکھنے کے صابن خریدتے ہیں۔ بجائے سگرٹ پینے کے پوڈر اور کریم لیتے ہیں۔ اور بجائے ہوٹل میں آئسکریم کھانیکے

بیوی کیلئے ساڑی کی تو رلیجاتے ہیں۔ اب یہ معلوم کرنا مشکل ہے کہ وہ کبھی اِن عادات واطوار کے بھی تھے یا کیا۔ ایک زمانہ میں وہ دن بھر میں صرف دو وقت گھر جایا کرتے تھے مگر اب دن بھر میں ایک وقت بھی دس منٹ کیلئے گھر سے باہر نہیں نکلتے۔

ایک صاحب اس بُری طرح رتیجے ہوئے ہیں کہ ایک روز کیلئے بھی کہیں باہر جانا ہوتا ہے تو نیک بخت ساتھ ہوتی ہیں۔

چوتھے طبقے کے لوگ فی زمانہ ذرا کم ہیں۔ مگر قربان جائے خالق کے کہ اس تماشا گاہِ عالم میں طرح طرح کے پتلے نچاتا ہے ایک مولوی صاحب جو نہایت ہی کم سخن ہیں لیکن سنجیدہ ہیں۔ اس قدر مجبور ہیں کہ کوئی اِن کے گھر پر ملنے جائے تو بازار سے منگوا کر پان کھلاتے ہیں۔ یہ محض اس لئے کہ بیوی صاحبہ پان کی فرمائش پر اس قدر خفا ہوتی ہیں کہ اِن کو کم از کم دو روز تک پیٹ بھر کھانا نہیں ملتا۔

ایک بزرگ جبتک باہر رہتے ہیں چار چھ ڈبیاں سگریٹ کی خالی کر ڈالتے ہیں۔ مگر گھر میں کھانا کھانیکے بعد بھی سگریٹ پینے کی مجال نہیں۔ اس لئے کہ بیگم صاحبہ کو اس سے نفرت ہے۔

ایک صاحب کو بلا اجازت گھر سے باہر رہنے کی اجازت نہیں۔ اگر اتفاقاً رات بھر غائب رہیں تو صبح داخلہ ممنوع۔ مگر یہ اس قدر متین آدمی ہیں کہ

"میلاد شریف" کی شرکت کی اجازت لیکر احباب کے ہمراہ تھیٹر اکثر دیکھ لیتے ہیں۔ یہ بھی عجیب اتفاق ہے کہ میرے ملنے والوں میں اس پانچویں طبقہ کے لوگ بہت ہیں۔ ایک کرمفرما جو ماموں زاد ایسوسی ایشن کے ممبر اور ریاضیات کے گریجویٹ ہیں۔ ایسے خواہ مخواہ ہیں کہ پوچھئے نہیں بفضلہ تعالے گذشتہ چاروں طبقوں سے غیر متعلق مگر بے طرح پھنسے ہوئے ہیں۔ اگر بیگم صاحبہ ایک خط مستقیم کو زاویہ حادہ فرمادیں تو یہ جیومیٹری سے نہ سہی الجبرا ہی سے سہی مگر ثابت ضرور کر دینگے کہ زاویہ خط مستقیم ہی ہے۔ دوسرے ایک بزرگ جو اسی ایسوسی ایشن کے ممبر ہیں نہایت ہی پریشان رہتے ہیں اگر ان کے کسی عزیز کو ترقی ملتی ہے تو انکی نیک بخت وہ ہتھڑ چلانا شروع کرتی ہیں کہ دیکھو تمہارے فلاں عزیز کو ترقی ملی اور تم منہ دیکھا کئے تم بھی ترقی کرو مگر یہ بیچارے سوائے اس کے کہ اپنی سادہ لوحی میں ترقی کریں اور کچھ نہیں کرتے اور ایک بزرگ جو ایک معزز پیشہ کرتے ہیں اسی خواہ مخواہ میں مبتلا ہیں۔ انکی خزانہ دار بیگم صاحبہ ہیں۔ اگر کہیں باہر جانا ہوتا ہے تو ہر آور دپیش کیجاتی ہے کہ کرایہ ریل، کرایہ تانگہ، حمالی اسٹیشن، سوڈا، سگریٹ، چاء، بچوں کے لئے کھلونے، اخبار یا یک سٹال پر سے کوئی ناول۔ مگر یہ مد باقی نہیں رہتی اور نہ ان کا تخمینہ ہی کام دیتا ہے۔ کرایہ ریل تو خیر جنتری میں دیکھ لیا جاتا ہے مگر غضب یہ ہے کہ اسپنسر کے سوڈے کے بجائے ڈالٹن کا سوڈا پینے کیلئے

ایک آنہ اور رفرشمنٹ روم کے بجائے گرم چاء پینے کیلئے ایک آنہ منظور ہوتا ہے غور کیجئے بیچارے کس قدر معذور ہیں۔ ایک صاحب ہمیشہ بوتل بدست نظر آتے ہیں۔ جب کبھی دیکھئے دواخانہ کی گیٹ پر موجود۔ اگر ڈاکٹر صاحب آپریشن روم میں بھی ہوں تو یہ وہیں پہنچکر کیفیت سنانے لگتے ہیں "ڈاکٹر صاحب سنئے تو سہی رات مکان میں طبیعت بہت خراب ہی مغرب کے بعد سے دس بجے رات تک دو گلاس پانی پی گئیں۔ نیند بھی ٹھیک طور پر نہیں آئی کروٹیں بہت بدلتی رہیں۔ چھ سات بار کروٹ بدلی ہونگی صبح بھی جلد یعنی $\frac{1}{2}$ ۸ بجے بیدار ہو گئیں کہئے بخار تو نہیں ہوگا

اگر یونہی تفصیل لکھی جائے تو مشکل ہے طلسم ہوشربا کی طرح کئی جلدیں درکار ہونگی۔ میں انہیں فی الحال ختم کرتا ہوں مگر ایک بات پریشان کن یہ ہے کہ بعض افراد دوسرے اور تیسرے چوتھے طبقہ سے تعلق رکھتے ہیں مگر خوف مطلق نہیں ڈر نیکا نام تک نہیں لیتے الٹے حکومت کئے جاتے ہیں۔ ذرا غور تو کیجئے کہ یہ ہے کیا بات، کاش مولانا عبد الماجد اس طرف توجہ فرماتے یا کم از کم پروفیسر تاج الدین صاحب شمیم کو تو ضرور متوجہ ہونا چاہئے۔

ایک صاحب جو میرے مخلص ہیں بیوی کے گھر پر رہتے ہیں۔ اسی کا مال کھاتے ہیں۔ مگر اس حکومت اور شان کیساتھ کہ کچھ کہا نہیں جاتا۔ سالن میں نمک زیادہ ہو جائے تو دسترخوان الٹ دینگے۔ مارے چیخوں کے گھر سر پر

دوسرے طبقہ کے اکثر بزرگوں سے واقف ہوں۔ ایک بزرگوار ماموں زاد ایسوسی ایشن کے ممبر یعنی اپنی ماموں زاد بہن کے شوہر ہیں۔ بدنصیبی سے بچپن ہی میں یتیم ہو گئے تھے۔ ماموں ہی نے پڑھایا لکھایا اور نوکر رکھا دیا ان حضرت کی وقعت اپنی بیوی کے پاس وہی ہے جو ایک تانگہ والے کی پولیس کانسٹیبل کے پاس ہوتی ہے۔ بی۔ ایس۔ سی۔ ہیں مگر بیوی سے اسقدر مرعوب کہ اگر وہ ہلدی کی گرہ کو "ہڈرو فلورک ایسڈ" کہدے تو یہ معمل میں جاکر ثابت کرنے کو تیار ہو جائیں گے کہ واقعی ہلدی "ہڈرو فلورک" ہے اور ایک صاحب جو اسی زمرے سے متعلق ہیں۔ اس ایسوسی ایشن کے ممبر تو نہیں مگر اپنے خسر کے تموّل کی وجہ سے اس قدر مرعوب رہتے ہیں کہ ان کے ملازمین نے کلکتہ کے گلشن سلیپر سے انکی چندیا کے بال نکلتے دیکھا ہے۔

تیسرے طبقہ کے لوگ اکثر ملتے ہیں۔ ایک میرے عزیز بلائے حسن میں اس قدر مبتلا ہوئے کہ چوتھی چالوں کے اندر ہی اندر ماں بھائی بہن سب کو چھوڑ چھاڑ کر نیک بخت کے ساتھ علیحدہ جاکر رہنے لگے۔

اور ایک کرمفرما نے اپنے شوق ذوق کو محض اس لئے ترک کر دیا کہ انکی صاحبِ جمال رفیقۂ زندگی کی فرمائشات کی تکمیل کیلئے روپیہ کافی نہ تھا۔ اب وہ بجائے سینما دیکھنے کے صابن خریدتے ہیں۔ بجائے سگرٹ پینے کے پوڈر اور کریم لیتے ہیں۔ اور بجائے ہوٹل میں آئسکریم کھانیکے

بیوی کیلئے ساڑھی کی تو ر لیجاتے ہیں۔ اب یہ معلوم کرنا مشکل ہے کہ وہ کبھی ان عادات واطوار کے بھی تھے یا کیا۔ ایک زمانہ میں وہ دن بھر میں صرف دو وقت گھر جایا کرتے تھے مگر اب دن بھر میں ایک وقت بھی دس منٹ کیلئے گھر سے باہر نہیں نکلتے۔

ایک صاحب اس بری طرح ریجھے ہوئے ہیں کہ ایک روز کیلئے بھی کہیں باہر جانا ہوتا ہے تو نیک بخت ساتھ ہوتی ہیں۔

چوتھے طبقے کے لوگ فی زمانہ ذرا کم ہیں۔ مگر قربان جائے خالق کے کہ اس تماشا گاہِ عالم میں طرح طرح کے پتلے نچاتا ہے ایک مولوی صاحب جو نہایت ہی کم سخن، متین، سنجیدہ ہیں۔ اس قدر مجبور ہیں کہ کوئی ان کے گھر پر ملنے جائے تو بازار سے منگوا کر پان کھلاتے ہیں۔ یہ محض اس لئے کہ بیوی صاحبہ پان کی فرمائش پر اس قدر خفا ہوتی ہیں کہ ان کو کم از کم دو روز تک پیٹ بھر کھانا نہیں ملتا۔

ایک بزرگ جبتک باہر رہتے ہیں چار چھ ڈبیاں سگریٹ کی خالی کر ڈالتے ہیں۔ مگر گھر میں کھانا کھانیکے بعد بھی سگریٹ پینے کی مجال نہیں۔ اس لئے کہ بیگم صاحبہ کو اس سے نفرت ہے۔

ایک صاحب کو بلا اجازت گھر سے باہر رہنے کی اجازت نہیں۔ اگر اتفاقاً رات بھر غائب رہیں تو صبح داخلہ ممنوع۔ مگر یہ اس قدر متین آدمی ہیں کہ

"میلاد شریف" کی شرکت کی اجازت لیکر احباب کے ہمراہ تھیٹر اکثر دیکھ لیتے ہیں۔ یہ بھی عجیب اتفاق ہے کہ میرے ملنے والوں میں اس پانچویں طبقہ کے لوگ بہت ہیں۔ ایک کرمفرما جو ماموں زاد ایسوسی ایشن کے ممبر اور ریاضیات کے گریجویٹ ہیں۔ ایسے خواہ مخواہ ہیں کہ پوچھئے نہیں بفضلہ تعالیٰ گذشتہ چاروں طبقوں سے غیر متعلق مگر بے طرح پھنسے ہوئے ہیں۔ اگر بیگم صاحبہ ایک خط مستقیم کو زاویہ حادہ فرما دیں تو یہ جیومیٹری سے نہ سہی الجبرا ہی سے سہی مگر ثابت ضرور کر دینگے کہ زاویہ خط مستقیم ہے۔ دوسرے ایک بزرگ جو اسی ایسوسی ایشن کے ممبر ہیں نہایت ہی پریشان رہتے ہیں اگر ان کے کسی عزیز کو ترقی ملتی ہے تو انکی نیک بخت دو ہفتہ جلانا شروع کرتی ہیں کہ دیکھو تمہارے فلاں عزیز کو ترقی ملی اور تم منہ دیکھا کئے تم بھی ترقی کرو مگر یہ بیچارے سوائے اس کے کہ اپنی سادہ لوحی میں ترقی کریں اور کچھ نہیں کر سکتے اور ایک بزرگ جو ایک معزز پیشہ کرتے ہیں اسی خواہ مخواہ میں مبتلا ہیں۔ انکی خزانہ دار بیگم صاحبہ ہیں۔ اگر کہیں باہر جانا ہوتا ہے تو برآورد پیش کیجاتی ہے کہ کرایہ ریل، کرایہ تانگہ، حمالی اسٹیشن، سوڈا، سگریٹ، چاء، بچوں کے لئے کھلونے، اخبار یا ایک سٹال پر سے کوئی ناول۔ مگر یہ مد باقی نہیں رہتی اور نہ ان کا تخمینہ ہی کام دیتا ہے۔ کرایہ ریل تو خیر جنتری میں دیکھ لیا جاتا ہے مگر غضب یہ ہے کہ اسپنسر کے سوڈے کے بجائے ڈالٹن کا سوڈا پینے کیلئے

ایک آنہ اور رفرشمنٹ روم کے بجائے گرم چاء پینے کیلئے ایک آنہ منظور ہوتا ہے
غور کیجئے بیچارے کس قدر معذور ہیں۔ ایک صاحب ہمیشہ بوتل بدست نظر
آتے ہیں۔ جب کبھی دیکھئے دواخانہ کی گیٹ پر موجود۔ اگر ڈاکٹر صاحب آپریشن
روم میں بھی ہوں تو یہ وہیں پہنچکر کیفیت سنانے لگتے ہیں "ڈاکٹر صاحب
سنئے تو سہی رات مکان میں طبیعت بہت خراب ہی مغرب کے بعد سے
دس بجے رات تک دو گلاس پانی پی گئیں۔ نیند بھی ٹھیک طور پر نہیں آئی
کروٹیں بہت بدلتی رہیں۔ چھ سات بار کروٹ بدلی ہونگی صبح بھی جلد یعنی
$\frac{1}{2}$ ۸ بجے بیدار ہوگئیں کہئے بخار تو نہیں ہوگا

اگر یونہی تفصیل لکھی جائے تو مشکل ہے۔ طلسم ہوشربا کی طرح کئی جلدیں
درکار ہونگی۔ میں انہیں فی الحال ختم کرتا ہوں مگر ایک بات پریشان کن یہ ہو
کہ بعض افراد دوسرے اور تیسرے چوتھے طبقہ سے تعلق رکھتے ہیں مگر خوف
مطلق نہیں ڈر نہیکا نام تک نہیں لیتے الٹے حکومت کئے جاتے ہیں۔ ذرا
غور تو کیجئے کہ یہ ہے کیا بات، کاش مولانا عبدالماجد اس طرف توجہ فرماتے
یا کم از کم پروفیسر تاج الدین صاحب شمیم کو تو ضرور متوجہ ہونا چاہئے۔

ایک صاحب جو میرے مخلص ہیں بیوی کے گھر پر رہتے ہیں۔ اسی کا
مال کھاتے ہیں مگر اس حکومت اور شان کیساتھ کہ کچھ کہا نہیں جاتا۔ سالن
میں نمک زیادہ ہوجائے تو دستر خوان الٹ دینگے۔ مارے چیخوں کے گھر سر پر

—

اٹھا لیں گے۔ پان میں چونا بڑھ جائے تو سر کھا جائیں گے۔ بچی کے ہاتھ میں مٹھائی نظر آئے تو خود جھپٹ لیں گے۔ اور اگر وہ روئے تو ڈپٹ کر بڑھا دینگے۔ ان حضرت کا نام بدمذاقوں نے "ماٹھو" رکھا ہے مگر انکی شان اس سے بھی ارفع و اعلیٰ ہے

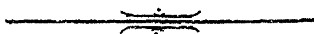
ایک بزرگ اپنے خسر کا مال نہایت ہی بیدردی سے صرف کرتے ہیں جب کبھی ضرورت پڑتی ہے بے تکلف اپنی رفیقۂ حیات سے کہلوا کر منگوا لیتے ہیں۔ مگر ان کا سیدھا ہاتھ ہمیشہ نیک بخت کی چوٹی ڈھونڈھتا رہتا ہے اور الٹا ہاتھ گال۔ کئی مرتبہ موقع واردات پر ہمیں بھی پہونچنا پڑا ہے۔

اور ایک حضرت بیوی کا جہیز اور زیور وغیرہ اپنے شوق و ذوق کی نذر کر چکے ہیں۔ بیچاری کو اسیقدر وقعت دیتے ہیں جتنی کہ ایک سیول سرجن گاؤں کی دایہ کو

اور بھی اکثر اصحاب اسی قبیل کے ملتے ہیں۔ ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ کیا بات ہے۔ اِن رموز و غوامض کا پتہ اُوسوقت چل سکتا ہے کہ ایک مرتبہ ہندوستان کی مردم شماری اسطرح کیجائے کہ "ڈرنے والے مرد" اور "نڈر مرد" علیحدہ علیحدہ شمار کر لئے جائیں اور پھر یہ دیکھا جائے کہ ڈرنیوالے کتنے پانچ طبقوں سے تعلق رکھتے ہیں یا کیا۔ اور نڈر کتنے طبقوں پر منقسم ہیں۔ کم از کم ایسے مردوں کے دماغ خرید لئے جانے چاہئیں تاکہ یہ دیکھا جا سکے کہ اُنمیں کوئی غیر معمولی بات تو نہیں ہے یا اِن کے دل و جگر کا معائنہ کیا جانا چاہئے تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ ایک نڈر کا دل ایک ڈرنیوالے کے دل سے کتنے گز لمبا یا چوڑا ہوتا ہے اور اسیطرح نڈر اور ڈرنیوالی

صنف نازک کے دل و دماغ کا معائنہ کیا جائے تو امید ہو سکتی کہ ہم کسی صحیح نتیجہ پر پہونچیں۔

یا شادی شدہ لوگوں کا ایک کلب قائم کیا جائے اور سارے ہندوستان میں اسکے ماتحت ایک ایک کلب قائم ہو تو کچھ پتہ چلیگا کہ یہ ہے کیا بلا۔ اگر موقع ملے تو یہ مسئلہ مجلس متفقہ میں پیش کیا جائے گا۔ اور فیصلہ سے متعاقب اطلاع دیجائیگی۔



عطردان

"اپنا ولایتی عطردان دے دیا ہوتا۔ سینٹ کی شیشی دیدیتے۔ میرا عطردان کیوں دیا۔ تم کو میری چیزوں سے اتنی دلچسپی کیوں؟ اتنی دشمنی کس واسطے؟ بغض کس لئے؟ میں نے غلطی کی۔ ہاں ہاں مجھ سے غلطی ہو گئی۔ عطردان اندر سے بھجواتی ہی نہیں تو کوئی کیوں لیجاتا۔ مجھے کیوں ترسنا پڑتا۔ اپنا اچھا خاصہ عطردان دیکر کیوں روتی۔ تم کو کیا تمہیں فکر کس بات کی۔ کسی نے مانگا اور تمنے دیدیا یہ تو کہو غیروں کے مال پر دیدے لال کرنے والے تم کون"؟

زہرہ بیگم دالان میں بیٹھی ہوئی کڑک رہی تھیں۔ چہرہ تمتمایا ہوا تھا۔ سارا بدن غصہ سے کانپ رہا تھا۔ بڑی بچی حیرانی سے منہ تک رہی تھی۔ بچہ اپنے ربڑ کے کبوتر کو دونوں ہاتھوں سے دبائے ہوئے کھڑا تھا۔ کبھی اپنی ماں کی صورت غور سے دیکھتا کبھی باپ کے چہرے پر نظریں گاڑ دیتا اور کبھی بہن کو دیکھکر خاموش ہو جاتا۔ عابد صوفے پر بیٹھا ہوا تھا۔ ہاتھ میں سگرٹ تھا۔ مگر وہ پی نہیں سکتا تھا

غصہ، شرم، خجالت، نفرت، مختلف جذبات اس کے دل و دماغ کو متاثر کر رہے تھے۔ چہرہ بالکل زرد تھا۔ وہ محسوس نہیں کر سکتا تھا کہ کیا ہو رہا ہے زہرہ بیگم کی زبان چل رہی تھی اور وہ پُر جوش لہجہ میں مسلسل تقریر کر رہی تھیں۔ "میں کہتی ہوں وہ مسافر تھے تو مسافروں کی طرح رہتے۔ چھ آنہ کی سینٹ کی شیشی خرید لیتے۔ چار شیشیوں والا عطردان لے لیتے کیا انہیں دو روپیہ بھی نصیب نہ تھے تم دوست ہی تھے تو ایک عطردان منگوا دیا ہوتا۔ میرا عطردان انہیں دینا کیا ضرور تھا۔ اجی وہ قائم مقام ہو کر آئے ہیں یا منصرم تنہا ہوں یا زنانہ کے ساتھ۔ عید کو گھر جانے کی چھٹی ملے یا نہ ملے مجھے اس سے کیا کام مجھے کیا واسطہ۔ میرا عطردان انہیں کیوں دیا جائے مجسٹریٹ ہو کر آئے کہیں سے دو روپیہ کا عطردان تک نصیب نہیں اور سنو کہیں سے چار آنہ تولہ کا عطر بھی میسر نہیں آیا۔ میرا بھرا بھرایا عطردان لیگئے۔ ایسا ہی لیجانا تھا تو خالی عطردان لیگئے ہوتے۔ میں نے پرسوں ہی تو عطر منگوایا تھا۔ سولہ روپیہ تولہ والا عطر کبھی انہیں نصیب بھی ہوا ہوگا؟ دو دن اور صرف دو دن کیلئے، واہ اچھے آئے عطردان مانگنے۔ میں پوچھتی ہوں آخر مجھ سے دریافت کیوں نہ کر لیا۔ اپنا عطرداں کیوں نہ دیدیا۔ میرے عطردان سے کیا خصوصیت تھی باہر بیٹھکر لگے حکومت کرنے۔ عطردان منگوایا میں نے یہ سمجھ کر بھجوا دیا کہ کسی کو دکھائیں گے۔ بھلا مجھے کیا معلوم تھا کہ کوئی ڈاکو آیا ہے وہ لے ہی جائیگا۔"

اٹھالیں گے۔ پان میں چونا بڑھ جائے تو سر کھا جائیں گے۔ بچی کے ہاتھ میں مٹھائی نظر آئے تو خود جھپٹ لیں گے۔ اور اگر وہ روئے تو ڈپٹ کر بڑھا دینگے۔ ان حضرت کا نام بدمذاقوں نے "ماٹھو" رکھا ہے مگر انکی شان اس سے بھی ارفع و اعلیٰ ہے

ایک بزرگ اپنے خسر کا مال نہایت ہی بیدردی سے صرف کرتے ہیں جب کبھی ضرورت پڑتی ہے بے تکلف اپنی رفیقۂ حیات سے کہلوا کر منگوا لیتے ہیں۔ مگر ان کا سیدھا ہاتھ ہمیشہ نیک بخت کی چوٹی ڈھونڈھتا رہتا ہے اور الٹا ہاتھ گال کئی مرتبہ موقع واردات پر ہمیں بھی پہونچنا پڑا ہے۔

اور ایک حضرت بیوی کا جہیز اور زیور وغیرہ اپنے شوق و ذوق کی نذر کر چکے ہیں۔ بیچاری کو اسقدر وقعت دیتے ہیں جتنی کہ ایک سیول سرجن گاؤں کی دایہ کو

اور بھی اکثر اصحاب اسی قبیل کے ملتے ہیں۔ ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ کیا بات ہے۔ ان رموز و غوامض کا پتہ اوسوقت چل سکتا ہے کہ ایک مرتبہ ہندوستان کی مردم شماری اسطرح کیجائے کہ "ڈرنے والے مرد" اور "نڈر مرد" علیحدہ علیحدہ شمار کر لئے جائیں اور پھر یہ دیکھا جائے کہ ڈرنیوالے انہیں پانچ طبقوں سے تعلق رکھتے ہیں یا کیا۔ اور نڈر کتنے طبقوں پر منقسم ہیں۔ کم از کم ایسے مردوں کے دماغ خرید لئے جانے چاہئیں تاکہ یہ دیکھا جا سکے کہ انمیں کوئی غیر معمولی بات تو نہیں ہے یا ان کے دل و جگر کا معائنہ کیا جانا چاہئے تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ ایک نڈر کا دل ایک ڈرنیوالے کے دلسے کتنے گز لمبا یا چوڑا ہوتا ہے اور اسیطرح نڈر اور ڈرنیوالی

صنف نازک کے دل و دماغ کا معائنہ کیا جائے تو امید ہو سکتی کہ ہم کسی صحیح نتیجہ پر پہونچیں۔

یا شادی شدہ لوگوں کا ایک کلب قائم کیا جائے اور سارے ہندوستان میں اسکے ماتحت ایک ایک کلب قائم ہو تو کچھ پتہ چلیگا کہ یہ ہے کیا بلا۔ اگر موقع ملے تو یہ مسئلہ مجلس متفقہ میں پیش کیا جائے گا۔ اور فیصلہ سے متعاقب اطلاع دیجائیگی۔



عطردان

"اپنا ولایتی عطردان دے دیا ہوتا۔ سینٹ کی شیشی دیدیتے۔ میرا عطردان کیوں دیا۔ تم کو میری چیزوں سے اتنی دلچسپی کیوں؟ اتنی دشمنی کس واسطے؟ بغض کس لئے؟ میں نے غلطی کی۔ ہاں ہاں مجھ سے غلطی ہوگئی۔ عطردان اندر سے بھجواتی ہی نہیں تو کوئی کیوں لیجاتا۔ مجھے کیوں ترسنا پڑتا۔ اپنا اچھا خاصہ عطردان دیکر کیوں روتی۔ تم کو کیا تمہیں فکر کس بات کی۔ کسی نے مانگا اور تم نے دیدیا یہ تو کہو غیروں کے مال پر دیدے لال کرنے والے تم کون"۔؟

زہرہ بیگم دالان میں بیٹھی ہوئی گرج رہی تھیں۔ چہرہ تمتمایا ہوا تھا۔ سارا بدن غصہ سے کانپ رہا تھا۔ بڑی بچی حیرانی سے منہ تک رہی تھی۔ بچہ اپنے ربڑ کے کبوتر کو دونوں ہاتھوں سے دبائے ہوئے کھڑا تھا۔ کبھی ماں کی صورت غور سے دیکھتا کبھی باپ کے چہرے پر نظریں گاڑ دیتا اور کبھی بہن کو دیکھکر خاموش ہو جاتا۔ عابد صوفے پر بیٹھا ہوا تھا۔ ہاتھ میں سگرٹ تھا۔ مگر وہ پی نہیں سکتا تھا

غصہ، شرم، خجالت، نفرت، مختلف جذبات اس کے دل و دماغ کو متاثر
کر رہے تھے۔ چہرہ بالکل زرد تھا۔ وہ محسوس نہیں کر سکتا تھا کہ کیا ہو رہا ہے
زہرہ بیگم کی زبان چل رہی تھی اور وہ پر جوش لہجہ میں مسلسل تقریر کر رہی تھیں۔
"میں کہتی ہوں وہ مسافر تھے تو مسافروں کی طرح رہتے۔ چھ آنہ کی سینٹ
کی شیشی خرید لیتے۔ چار شیشیوں والا عطردان لے لیتے کیا انہیں دو روپیہ بھی
نصیب نہ تھے تم دوست ہی تھے تو ایک عطردان منگوا دیا ہوتا۔ میرا عطردان
انہیں دینا کیا ضرور تھا۔ اجی وہ قائم مقام ہو کر آئے ہیں یا منصرم تنہا ہوں
یا زنانہ کے ساتھ۔ حمید کو گھر جانے کی چھٹی ملے یا نہ ملے مجھے اس سے کیا کام مجھے
کیا واسطہ۔ میرا عطردان انہیں کیوں دیا جائے مجسٹریٹ ہو کر آئے کہیں سے
دو روپیہ کا عطردان تک نصیب نہیں اور سنو کہیں سے چار آنہ تولہ کا عطر بھی
میسر نہیں آیا۔ میرا بھرا بھرایا عطردان لے گئے۔ ایسا ہی لیجانا تھا تو خالی عطردان
لے گئے ہوتے۔ میں نے پرسوں ہی تو عطر منگوایا تھا۔ سولہ روپیہ تولہ والا عطر
کبھی انہیں نصیب بھی ہوا ہوگا؟ دو دن اور صرف دو دن کیلئے، واہ اچھے
آئے عطردان مانگنے۔ میں پوچھتی ہوں آخر مجھ سے دریافت کیوں نہ کر لیا۔ اپنا
عطردان کیوں نہ دیدیا۔ میرے عطردان سے کیا خصوصیت تھی باہر بیٹھکر لگے
حکومت کرنے۔ عطردان منگوایا میں نے یہ سمجھ کر بھجوا دیا کہ کسی کو دکھائیں گے۔
بھلا مجھے کیا معلوم تھا کہ کوئی ڈاکو آیا ہے وہ لے ہی جائیگا۔"

" یہ عطردان باواجان نے کریم نگر میں خاص طور پر بنوایا تھا۔ جالی کا کام کتنا عمدہ تھا۔ اندر کی مخمل کی گدی "مس پرپرا" نے لگائی تھی۔ کتنا عمدہ مخمل تھا اسپر گوٹ کتنی اچھی تھی۔ ماموجان نے کتنے دنوں کے تقاضے کے بعد اس پر سونے کے پھول لگوائے تھے۔ پہلے وہ تین شیشیوں کا تھا۔ نگر میں نے چچا ابا سے کہکر بڑی شیشی منگوائی۔ انہوں نے بمبئی سے لادی تھی۔ کتنی اچھی شیشی تھی پورے چار تولے عطر کی تھی۔ اس پر طلائی کام کتنا اچھا تھا۔ مگر خیر وضع کی ایسی شیشیاں ملتی کہاں ہیں۔ اندر کا آئینہ کتنا خوبصورت تھا۔ اکبر نے اس پر بیل بوٹے بنائے تھے۔ میرا نام بھی اسی نے کھدوا یا تھا۔ جب اُن لوگوں کو معلوم ہوگا تو وہ بُرا نہ مانینگے؟ انہوں نے ایک چیز شوق سے لادی تھی۔ اِن کا تحفہ بھلا میں کسی کو کیوں دینے چلی تھی۔ مگر تم نے خیال تک نہیں کیا۔ تم کو اسی عطردان سے اتنی خصوصیت کیوں تھی۔ اپنا ولایتی عطرداں چھ شیشیوں والا دیدیا ہوتا۔"

"کوشلیا کی تصویر انلارج کرنے کوئی لے گیا ابتک لا رہا ہے۔ موئی پان کی ڈبیہ کی بھی کچھ حقیقت ہے وہ بھی ایک صاحب مانگ لیگئے۔ کتابیں سینکڑوں چلی گئیں ابتک واپس آرہی ہیں ایسے دوست بھی کسی کے ہونگے۔ جو لیگئے لیگئے واپسی کا نام تک نہیں۔ وہ بیچارہ عطردان الگ لیگیا۔ آخر میرے بھی لڑکیاں ہیں۔ مجھے بھی اپنی لڑکی کا جہیز جوڑنا ہے میں تیار کر کے جوڑوں اور تم لوگوں کو حوالے کردو، داماد آئیگا تو منہ پر نہ تھوکے گا؟ نواب کے بیٹے خود جاگیردار

پھر مہتمم پانچسو روپیہ تنخواہ اور جہیز میں بیٹی کو کیا دیا، چند انگریزی رسالے۔ دو چار پرانی کتابیں۔ چند تصاویر۔ بس یہی کائنات بھلا ایسے شخص کی بیٹی کون بیاہیگا؟

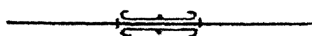
"کل عید ہے نواب زین الدین خاں کی بیوی ضرور آئینگی۔ ناظم صاحب کی بہن کا آنا لازمی ہے۔ تعلقدار صاحب کی بیوی کو میں نے دعوت دی ہے اور سب عورتیں آئینگی۔ تمہارے دوستونکی سب بیبیاں آئینگی۔ انہیں کیا دونگی وہ عطردان نہ دیکھ کر کیا خیال کرینگی۔ حضرتِ عباسؑ کی قسم میں تمہارے عطردان کو ہاتھ نہ لگاؤنگی۔ اس کی چھاؤں تک نہ دیکھونگی۔ اس کو اندر نہ لانے دونگی۔ اپنا اچھا خاصہ عطردان دیکر لوگوں کا عطردان میں کیوں لوں۔ مجھے کیا غرض پڑی ہے۔ سب آئینگی اور یوں ہی چلی جائینگی۔ کسی کو عطر نہیں ملیگا وہ کیا خیال کرینگی۔ یہی نا بدنامی ہوگی۔ ہونے دو۔ تمہارا ہی نام بدنام ہوگا۔ تمہیں کچھ تو سزا ملنی چاہیئے۔ تم ایک دن گھر لٹا دوگے۔ ان دوستونکے پیچھے برباد ہوجاوگے بچی کے ایرنگ ٹوٹے پڑے ہیں۔ تین دن سے کہہ رہی ہوں مگر کوئی سنتا نہیں۔ تمہیں بچی کی کیا فکر تمہیں گھر کا کیا خیال۔ تم کیوں یاد رکھوگے تمہیں کلب کی فکر رہے گی۔ تمہیں دوستوں کا خیال رہے گا۔ عید آئی تو عطردان اور وہ بھی لوگوں کا بے مانگے بلا پوچھے دیدوگے تمکو بچی سے کیا واسطہ کیوں خیال رہنے لگا

اگلے سال وہ آئے تھے کوئی خان بہادر غنیمت یہ کہ انہیں رہنے کو مکان مل گیا۔ بیچارے نے دو آنے کا تو ادو پیسے کا چمٹا تک نہیں خریدا ہمارے

گھر سے تو گیا۔ میرے جہیز کا ڈنر سٹ کتنا نفیس بھار کابیوں پر حضور کی تصویر کیتنی اچھی تھی۔ سب پھوٹ پھاٹ کر رکابیوں کے چار ٹھیکرے دو ڈش ہی تو رہ گئے تھے۔ خان بہادر نے وہ تیس مار خانی دکھائی کہ اس میں سے بھی دو دو رکابیاں ایک ڈش توڑ کر بھیجا۔ ایسا ہی کوئی پاٹر توڑ کر خان بہادر بنے ہونگے اے تم نے قدردانی نہیں کی صاحب سے کہکر اب بھی کوئی اے بی۔ سی ڈی کا خطاب لادیا ہوتا۔ آخر تین برتن شہید کئے تھے۔ کوئی ٹھٹھا مذاق نہ تھا میرا سٹ خراب ہوگیا تمہاری جوتی سے۔ میری رکابیاں پھوٹ گئیں تمہاری بلا سے میری ڈش ٹوٹ گئی تمہیں پروا نہیں ہوئی۔ تمہیں تو بس دوستوں کی۔ میرا عطردان اٹھا کر دے دیا۔ اب کی دفعہ کوئی چیز دیکر تو دیکھو۔ علمبردار کی قسم تمہارا کالا ڈریس فقیر کو دیدونگی۔ بلٹ باؤلی میں نہ پھنکوا دیا تو زہرہ نہ کہنا کرچ کو چولھے میں نہ لگا دوں تو سہی۔ آخر کوئی حد بھی ہے۔ دیکھو نا اچھا خاصا عطردان اٹھا کر دیدیا۔ اب وہ ضرور واپس کرینگے۔ یقیناً لادینگے۔ گر پڑ کر چھینچے گا نہیں بے احتیاطی سے آئینہ بھی نہیں ٹوٹے گا۔ مخمل پر عطر کے دھبے کبھی نہیں گرینگے۔ شیشی واقعی سلامت آئیگی۔ عطر تو خرچ ہی نہ ہوگا۔

" اس مردوے سے عطر تک خریدا نہ گیا۔ اسی منہ پر تم کہہ رہے تھے علیگڈھ کالج کے بی اے ہیں۔ مجسٹریٹ ہو کر آئے ہیں۔ جوبلی میں ملاقات ہوئی تھی بڑے شریف ہیں۔ ماشاء اللہ علیگڈھ کالج کے بی۔ اے عطردان بھی مانگتے پھرتے ہونگے۔

مجسٹریٹ ہو کر آئیں بھی تو عطرداں مانگینگے۔ جوبلی میں بھی کسی کا عطردان چرائے
گئے ہونگے۔ شریف آدمی جوتے تھوڑا ہی چراتے ہیں۔ صرف عطردان مانگ لیجاتے ہیں۔
عابد کا سر چکرانے لگا۔ آنکھوں میں اندھیرا آگیا۔ وہ بدقت اٹھ کر اپنے
ڈرائنگ روم تک پہنچ سکا۔ وہاں بھی اسے اپنی بیوی کی آواز صاف سنائی
دے رہی تھی۔ وہ آرام کرسی پر بلاارادہ بیٹھ گیا۔ خود بخود پاؤں سیدھے ہو گئے
اور پیٹھ کرسی سے لگ گئی۔ اسے نیند آگئی اور خواب دیکھنے لگا کہ دنیا ایک
بہت بڑا عطردان ہے۔ آسمان آئینہ بنا ہوا سر پر ہے۔ بڑے بڑے پہاڑ
مخمل کی گدی معلوم ہو رہے ہیں اور وہ کمرخی شیشی بنا ہوا بیچ میں بیٹھا ہوا ہے



بدحواسی

حضرتِ آزاد[1] بھی عجیب بزرگ ہیں، چونکہ ہم سے خلوص ہے اور ہماری مالی حالت سے واقف ہیں۔ اسلئے اکثر ہمارے فائدے پر بھی ایک سرسری نظر ڈال لیتے ہیں۔ آج مکتبہ[2] میں بیٹھ کر آپ نے بکمال متانت "معاوضۂ مضامین" پر گفتگو شروع کی دیر تک نصیحت فرماتے رہے کہ معاوضہ لیکر مضامین لکھو، ہم اس کے خلاف ہیں نہ تو ہم اردو پریس کی حالت اتنی اچھی پاتے ہیں کہ وہ معاوضہ دے سکے اور نہ ہم "بہ ایں مفلسی" اس قدر گئے گذرے ہیں کہ معاوضہ لیں بہرحال دیر تک مباحثہ ہوتا رہا، لوگ مدلّل اور غیر مدلّل تقریر پر غور نہیں کرتے گرج دار آواز، تیز و تند لب و لہجہ، اور بھاری بھرکم الفاظ سے بہت مرعوب ہوجاتے ہیں۔ اسی طرح ہماری مدلّل مگر ضعیف و ناتوان، منحنی، تقریر پر کسی نے

---

[1] محمد مرزا خاں صاحب آزاد۔

[2] مکتبہ ابراہیمیہ امداد باہمی اسٹیشن روڈ حیدرآباد دکن۔

کان ہی نہیں دیا، خدا رکھے جناب آزاد ہیں بھاری بھر کم مرد متین، الفربہ خواہ مخواہ بھلے آدمی، آواز گرجدار لہجہ تیز و تند، توند کا پھیلاؤ، ہاتھوں کا بڑھاؤ، مونچھوں کا رعب، یہ سب چیزیں ان کے ساتھ تھیں۔ عبدالرحمٰن صاحب بھی اپنی ہی لگانے لگے۔ اور تصدق حسین صاحب بھی ساتھ ہو گئے۔ بیچارے عبدالحق صاحب[1] کبھی کبھی ہماری کمزور، ناتوان، ضعیف، زار و نزار رائے سے اتفاق کر لیتے مگر دل سے نہیں، صرف آزاد صاحب کو ستانے! دو گھنٹے یہی دردِ سری رہی معلوم نہیں اپنے مقصد میں کون کامیاب رہا۔ مگر ہم گھر پہونچکر اس خیال میں محو ہو گئے کہ میدان ہم نے مار لیا اور حضرتِ آزاد بھی یہی سمجھے ہوئے ہیں کہ انہوں نے جیتا وہ تو کہا ہے نا کہ، ہر کس بخیال خویش خبطے دارد،

فطرت نگار مہاشے سدرشن بڑے گپی ہیں انکی پیں (افسانے) بہت مقبول ہیں۔ ہم آتے آتے ایک جلد لیتے آئے تھے۔ کھانا کھا کر لگے مطالعہ کرنے سدرشن جی نے خوب افسانے لکھے ہیں "بہارستان اور چند دن" دونوں کو ہم نے دیکھا نو بجے سے دو بجے تک کرسی پر پڑے دیکھا کئے۔ جب دونوں کتابیں ختم ہوئیں تو ہم نے ان پر تنقید شروع کی "معجوبۂ فرعون" بڑی عمدہ گپ تھی۔ ہم اسکی تعریف میں اس قدر رطب اللسان ہوئے کہ تین بج گئے ساڑھے تین بجے رات کو الارم بجا ہماری نیک بخت برابر کے کمرے میں سو رہی تھیں شاید بیدار ہوئیں تو ہمیں

---

[1] جناب محمد عبدالحق صاحب ڈائرکٹر و منیجر مکتبہ ابراہیمیہ

پہلو میں نہ پایا بس پھر کیا تھا برس پڑیں آگ لگے ان کتابوں کو اور خدا کی سنوار اس مطالعہ پر ساڑھے تین بج گئے مگر آپ ابھی مطالعہ فرما رہے ہیں، افیونی کی افیون چھوٹ جائے، حافظ کی نماز قضا ہو مگر آپکے ہاتھ سے کتاب نہ چھوٹیگی ایسے کتابوں کے رسیا دیکھنے میں نہیں آئے۔ آدمی کیا جھینگر ہیں کہ دن بھر کتابیں چاٹا کرتے ہیں۔"

ہم نے سگرٹ جلالیا اور دونوں ہاتھوں سے لگے میز پر طبلہ بجانے مگر گراما فون چلتا رہا۔ ہزاروں صلواتیں اڑیں، سینکڑوں پھبتیاں کسی گئیں مگر ہم ٹس سے مس نہ ہوئے، آپ شاید ہم کو صرف "رائل ایشیاٹک سوسائٹی اور "جامعہ معارف" ہی کا ممبر تصور کرتے ہیں۔ اجی حضرت! اس کے علاوہ بھی ہم کو ایک اور اعزاز حاصل ہے وہ یہ کہ ہم "ماموں زاد ایسوسی ایشن" کے ممبر یعنے "ماموں زاد بہن کے شوہر ہیں" اور وہ بھی "نان ریسی ڈونٹ" یعنے اپنے گھر پر بیوی کو رکھنے والے نہیں۔ "ریسی ڈنٹ ممبر" یعنے "خانہ داماد" ہیں اس اعزاز کے ہاتھوں ہم آئے دن پریشان رہتے ہیں۔ ہماری عزت سسرال میں اوسیقدر ہے جس قدر سائمن کمیشن والوں کی ہندوستانیں!

"وہ" صلواتیں سنا کر چلی گئیں، ماماؤں اور چھوکریوں کو پکار پکار کر جگایا۔ اونٹنیں بیچ صحن میں کھڑی ہو کر چیخنے، چلانے، جمائی نے انگڑائی لی، ماموں لاحول ولاقوۃ الا باللہ پڑھتے ہوئے اوٹھ بیٹھے، بچے بوڑھے سب ہی۔

جاگ پڑے، کھانسنے، کھنکارنے کی سُریلی آوازیں ہماری سامعہ نوازی کرنے
لگیں، ہم نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، جھٹ جاکر چارپائی پر لد گئے اور رضائی اوڑھ لی
اور روزے کی فلاسفی، تراویح کی برکت نماز کی ضرورت کو سوچتے ہوئے سو گئے
خبر نہیں کتنی دیر سوتے رہے دیکھتے کیا ہیں کہ وہ نہایت ہی پیار سے گلے میں
باہیں ڈال کر کہہ رہی ہیں "دیکھو تم روزہ نہ رکھو" مگر اسی وقت ہماری ران میں
درد ہونے لگا، آنکھیں کھلیں تو "وہ" کھڑی نظر آئیں اور اسی دلگداز آوازمیں
سحری کی دعوت دے رہی تھیں، اللہ کتنا اچھا خواب تھا، واقعہ تو یہ ہے کہ
وہ خواب ہی میں کچھ اچھی طرح ملتی ہیں۔ ورنہ ظاہرداری کو کیا کہوں بقول حسن
بن صباح کے ہر ظاہر کا ایک باطن ہے، ہماری ظاہرداری کے باطن وہ خواب
ہیں جو رات بھر ہمیں نظر آتے ہیں جن میں ہماری نیک بخت بڑی خیر خواہ نظر آتی
ہیں اور نہایت ہی محبت سے ملتی ہیں، ورنہ ظاہر میں تو سیدھے منہ بات تک
نہیں کرتیں، ہم اُٹھ بیٹھے جلد جلد منہ دھویا بختاور نے دستر خوان بچھا دیا،
ابھی ہم بال ٹھیک کر رہے تھے کہ نیک بخت نے دستر خوان پر دھاوا بول دیا
اور لگیں چیخنے اجی! کھانا ٹھنڈا ہوا جاتا ہے سحر تو کر لو، پھر دن بھر بن سنور لینا"
اب آپ کون سے سدّی عنبر بازار جا رہے ہیں جو اس قدر بناؤ چناؤ ہو رہا ہے
بیچاری عورتیں بناؤ سنگار کیلئے بدنام ہیں مگر مردوں کو کوئی کہتا نہیں۔
"داڑھی ہی بنانے میں دو گھنٹے لگا دینگے آدھے گھنٹے تک مونچھیں

برابر کریں گے، پھر کریم ملنے کو ایک گھنٹہ لیں گے، پوڈر کو پندرہ منٹ ضرور
لگیں گے۔ منہ دھونے بیٹھیں تو خیر سے ایک گھنٹہ صرف کریں گے پھر آئینے
کے سامنے کھڑے ہوئے بال پونچھ رہے ہیں اس سے فارغ ہوئے تو لگے بال
سنوارنے اللہ اللہ بالوں کی خاطر تو گھنٹوں تک زحمت اٹھائیں گے تم لوگوں کی
مانگ سیدھی ہونے تک ہماری کھجوری چوٹی تیار ہو جاتی ہے۔ مگر پھر بھی ہم
بدنام ہیں۔ چھوڑو بھی بناؤ سنگار عورتوں ہی کو زیبا ہے اور پھر ان عورتوں کو
جو ہوائی دیدہ ہوں یا بازار کی بیٹھنے والی ہوں۔ ہم نے تو شریف گھرانے کی
بہو بیٹیوں کو کبھی بنتے سنورتے نہیں دیکھا۔"

یہ باتیں سنکر ہم آگ ہی تو ہو گئے مگر کرتے کیا ع بر سرِ فرزندِ آدم ہر چہ
آید بگذرد، کہکر کنگھا رکھ چھوڑا، برش پھینک دیا توال کندھے پر ڈالکر دسترخوان
پر آ بیٹھے۔ بھوک تو خاک نہ تھی مگر تھوڑا بہت زہر مار کرکے اٹھ کھڑے ہوئے
میز پر "مرزائی کوک شاستر" یعنی "بہشتی جھومر" رکھی ہوئی تھی اسی کو دیکھنے لگے
مرزا صاحب پہ بہت غصہ آیا کہ انہوں نے کتاب بعد از وقت لکھی کاش یہ کتاب
ہماری نیک بخت کے بچپن میں لکھی جاتی اور وہ بچپن ہی میں اسے پڑھتیں کچھ
نہ کچھ اثر تو ہوتا اور ہمکو ذرا اطمینان تو حاصل ہوتا۔ مگر مرزا جی نے بدقسمتی سے
لکھی بھی تو کب جبکہ خیر سے وہ دو بچوں کی ماں ہو چکیں تھیں، اور ہمیں دی بھی
تو کب جبکہ وہ "لڑنے میں طاق، اکڑنے میں شہرۂ آفاق، جھگڑنے میں مشاق۔"

ہو چکیں تھیں۔ اس وقت یہ کتاب کیا فائدہ پہونچاتی وہ تو کہا ہے نا!

چوں ترا احساں کہ خواہی ہیچ

وہ کھا چکیں تو چائے بنائیں گر اتنی توفیق نہ ہوئی کہ پیالی ہماری طرف بڑھا دیتیں، کالی کلوٹی نجّا ور نے پیالی ہمارے سامنے رکھدی اور ہم نے پہلا گھونٹ پیا، چائے اچھی تھی مگر اپنی تین صفتوں یعنے لب بند، لب ریز، لب سوز، میں صرف درمیانی صفت سے بھری ہوئی تھی۔ شکر تو نام کو نہ تھی اور اس قدر سرد تھی کہ آگے چلکر شربت بادام کا گمان ہونے لگا تھا۔ مگر کرتے کیا شکر مانگنا دوسرے معنی میں افیونی ہونے کا اعلان کرنا تھا۔ اور ٹھنڈی ہونے کی شکایت کرنا گویا شامت بلانی تھی، بھلا اب کس کی ہمت تھی جو انکی دلچسپ تقریر سنتا ہم نے "بہ از شیر مادر" سمجھکر اسی پیالی کو ختم کیا، اور سگرٹ جلالیا بدنصیبی سے پان بھی نہیں نصیب ہوا۔ مانگنا ہماری وضعداری کے خلاف تھا۔ کرسی کے نیچے لونگ پڑا ہوا نظر آیا، ہم نے اس کے قریب سگرٹ گرادیا اور پھر جھک کر سگرٹ کے ساتھ لونگ بھی اٹھالیا، اور لگے چبانے۔

"وہ" جا کر اپنی والدہ کے پاس بیٹھی رہیں، ختم سحر کی توپ دغی، کُلّیاں غرارے، شروع ہوئے، دیر تک وہ متبرک آواز آتی رہی اوّل کلمہ طیب کی گونج سنائی دیتی رہی مگر ہم سگرٹ پر سگرٹ جلاتے رہے۔ واقعی اسپورٹس مین ہوتا بھی اچھا سگرٹ ہے۔

صبح کے چھ بجے وہ کمرے میں آئیں تو ہم نے سگرٹ پھینک دیا اور لگے "تذکرۂ اولیا دکن" دیکھنے انہوں نے ترچھی چتوں سے ہماری طرف دیکھا اور اور جا کر چارپائی پر دراز ہوگئیں، دو منٹ کے انتظار کے بعد ہمنے سگرٹ جلا لیا اور لگے نظام گزٹ کیلئے گپ لکھنے ابھی ایک صفحہ بھی نہ ہوا تھا کہ پردہ ہٹا اور وہ برآمد ہوئیں ہم نے لاکھ چاہا کہ سگرٹ چھپالیں مگر ممکن نہ ہوا، دھوئیں نے بھانڈا پھوڑ دیا اب کیا تھا اُف....... "اچھا آپ میں یہ عادت بھی ہے شرم نہیں آتی ہمارے ساتھ سحری ہوتی ہے ہمارے ساتھ افطار اور پھر آپ الگ الگ سگرٹ بھی اڑاتے ہیں میں سحر کر کے سو جاتی ہوں تو آپ سگرٹ پیا کرتے ہیں۔ اسی لئے تو دن بھر آپ گھر پر نہیں رہتے اللہ اللہ کیسے کیسے لوگ دنیا میں ہیں اللہ میاں کو بھی دھوکہ دیتے ہیں اور ہم کو بھی تف ہے تمہاری زندگی پر لعنت ہے ایسی"...... ہم سمجھ رہے تھے کہ مارچ بینڈ بج رہا ہے اور بالاگھنٹ کی بے برگ و گیاہ وادیوں سے گذر کر ماہ تیر کی چلچلاتی دھوپ میں ٹھیک دو بجے ہم نے مارچ میں معرفت ہیں۔

جسوقت ہماری آنکھ کھلی تو دن کے ساڑھے تین بج چکے تھے، کمرہ کُرۂ نار بنا ہوا تھا جسم پسینہ میں ڈوبا ہوا تھا ہمارے برابر وحید الزماں صاحب ندوی فنا فی النوم تھے، سارا گھر سنسان تھا کبھی کبھی کسی کوے کی بے ہنگام آواز البتہ سنائی دیتی تھی، گھڑیال کی ٹک ٹک سخت وحشت انگیز تھی ہمنے سگرٹ جلایا منہ دھوئے بغیر شیروانی پہن لی گپ کا مسودہ جیب میں رکھا اور چلے "دفتر نظام گزٹ"

چارلی چپلن کا تماشہ

خدا جنت نصیب کرے والدِ مرحوم کو وہ فرمایا کرتے تھے کہ "انسان کی قسمت پھوٹتی ہے تو فوج میں نوکر ہوتا ہے۔" مگر یہ کلیہ ہماری نظر میں تو ذرا اُلٹا اترتا ہے بھئی ہم تو کہتے ہیں کہ "انسان کی قسمت پھوٹتی ہے تو گھر داماد ہوتا ہے۔"

خدا غارت کرے اس خانہ دامادی کو ہم نے دوسروں کو اچھی حالت میں دیکھ کر یہ سمجھ لیا تھا کہ اگر ہم بھی خانہ داماد بن جائیں تو خوب گذرے گی۔ مگر لاحول ولا سر منڈاتے ہی اولے پڑے۔ "ماٹھو" پر ہم فقرے کستے تھے۔ عنایت خاں پر پھبتیاں اڑاتے تھے۔ تقریباً سب گھر دامادوں کی دُرگت بناتے تھے مگر ہمیں کیا معلوم تھا کہ ایک روز ہم بھی گھر داماد بنینگے۔ اور گیدڑ کی طرح کیچڑ میں پھنس کر رہ جائینگے۔ ہائے

بُرا بول آگے آیا ہم جو بولے تھے لڑکپن میں

پرسوں ہم کو "چارلی چاپلن اِن گولڈن رش" دیکھنے کی سوجھی بعض احباب سے ملتے ملاتے تھیٹر پہنچے تو سات بج رہے تھے کھیل شروع ہو کر آدھ گھنٹہ گذر چکا تھا

ہم نے سوچا کہ چلو کسی اور جگہ بیٹھ رہیں۔ سیکنڈ شو دیکھ لینگے۔ اب جو آ کر علی گڑھ ہوٹل میں قیام کیا تو ملگئے حضرت سعیدی اور حضرت قریشی۔ حضرت آزاد وغیرہ۔ ساڑھے نو بجے تک علامہ سنلائٹ کا ذکر ہوتا رہا حضرت کی خانگی ہسٹری بچوں کی لائف انکی مضمون نگاری۔ اور سرقہ شعاری۔ حوالہ نویسی غرض ہر چیز پر مکمل اور مبسوط لکچر دیا گیا۔ پھر ہم چلے طرف سینما کے۔

گو شدت کی بھوک تھی مگر چارلی چاپلن کے نام نے تھوڑی دیر کیلئے معدے کو بھی مرعوب کرلیا۔ دس بجے سے ہم نے سینما دیکھنا شروع کیا تو بارہ بھی بج گئے اور ساڑھے بارہ ہونے آئے خدا خدا کرکے ہال سے نکلے۔ بھوک سے یونہی بُرا حال تھا۔ چاپلن کی مضحک حرکات پر ہنس ہنس کر آنتوں میں درد بھی مول لیا اب جو سائکل وصول کرنا چاہتے ہیں تو سائیکل بان" یعنی محافظ سائکل نے سائیکلوں کو ایک دیوار سے اس طرح جمایا تھا کہ پہلے کسی ایک شریف آدمی کی بائیسکل تھی۔ اس کے اوپر ہماری اور ہماری سائیکل کے اُوپر پوری پچاس سائکلیں۔ ہر شخص آتا اپنا ٹکٹ دیتا۔ اور نمبر وار سائیکل لیجاتا۔ ہم نے شمار کرنا شروع کیا۔ ۲۔ ۵۔ ۱۵۔ ۔ ۵۰ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ایک بجے کہیں نمبر ۲ آیا ہم نے جھٹ سے ٹکٹ پیش کیا اور سائکل لیکر چلنے گھر کی طرف رسی ڈلنی کی موٹر پر ایک موٹر سے معانقہ کرتے کرتے بچے۔ گوٹی گوڑہ کے چمن کے پاس ایک سائکل سوار سے گلے مل ہی لئے اور پتھر گھٹی پر ایک لڑکے کو

---

(۱) آرائیش بلدہ کی ہوا نے اب اس چمن کو اڑا ہی دیا۔

"ضرب خفیف نہ شدید" بلکہ سائیکل کی ٹکر دیتے ہوئے چار مینار تک آ گئے۔
میداں خاں کے چوک کے کتے بھی غضب کے ہیں۔ جعفر علی کے تابوت کے پاس سے
جو ہمارا خیر مقدم شروع کیا تو بس کوٹلہ کے دروازہ تک پہنچا کر چھوڑا۔ خیر یہ گذری کہ
کوٹلہ کے والنٹیر بھی ہمارے منتظر ہی تھے۔ پہلے تو انہوں نے خوش آمدید کہا مگر
ہمارے پیچھے اس "والنٹیر کور" کو دیکھ کر دست و گریباں ہو گئے ہم نے جو ایک
لانبا سانس لیکر سائیکل بڑھائی تو سیدھے گھر پر .... پھاٹک پر پہنچکر سائیکل
دیوار سے لگائی۔ کان دھر کر آہٹ جو لی تو رستم علی کے خراٹوں کی آواز سنائی
دینے لگی۔ ہم نے آؤ دیکھا نہ تاؤ کڑک کر آواز دی "رستم علی رستم۔ رستم ایک سانس
میں تین دفعہ پکارا۔ تب کہیں رستم علی نے کروٹ لی اور اُسی پینک کی رسیلی آواز
سے پوچھا "کون ہے رے" ہم نے کہا "بھئی میں ہوں" خیر یہ گذری کہ حضرت
سمجھ گئے۔ جلدی سے کھولدیا پھاٹک ہم نے اندر آ کر دیکھا تو اندر کا دروازہ بھی
بند۔ اب کیا کرتے اگر آوازیں دیں اور کچھ شور و شغب ہو تو زنانہ تک آواز جانے کا
اندیشہ رستم علی سے کہا کہ بھئی تم ہی کسی کو پکارو اور اپنے لئے کہکر دروازہ کھلواؤ
وہ غریب ان خانہ دامادی کے جھگڑوں کو کیا جانے کڑک کر آواز دے ہی دیا کہ
"دلاور دروازہ کھولو دولہا میاں آ گئے" خیر دلاور نے دروازہ کھولا۔ ہمارے ہاتھ سے
سائیکل لی۔ اور ہم داخل ہوئے۔ اب جو ہم دیکھتے ہیں تو زنانہ دروازہ بند!
بغضب خدا کا ہاتھ پاؤں بھول گئے۔ ہم نے پہلے تو چار لی چاپلن کی شان میں

کچھ مغلظات کا استعمال کیا۔ پھر اُس سائکل بان کو مخاطب کر کے کچھ سُنایا۔ سینما والے کو بھی نہ چھوڑا۔ مگر فائدہ کیا تھا۔ آستین چڑھا کر سیدھے ہاتھ سے زنانہ دروازے کی کنڈی کھولنی چاہی۔ دیر تک کوشش کرتے رہے مگر ممکن نہوا۔ دلاور کھڑا تماشا دیکھا کیا جب ہم نے ہار مان لی اور دروازہ کے پاس سے ہٹ گئے

تو اُس نے آگے بڑھکر ایک ذرا سے جھٹکے میں کنڈی کھولدی جھٹ سے ہم داخل ہوگئے اور آہستہ سے دروازہ کی کنڈی چڑھا کر اپنے کمرے کی راہ لی خیر یہ گذری کہ پاؤں میں کریپ سول شوز تھا۔ آواز بھی نہ ہوئی کمرے میں آکر شیروانی ٹوپی۔ شوز۔ پاتابے اُتارے۔ سگرٹ جلا کر سونے کے کمرے کو دیکھا تو بیگم صاحبہ نہایت ہی فراغت سے سو رہی تھیں۔ باہر آکر نعمت خانہ ٹٹولا کہ کچھ بسکٹ کیک یا میوہ ہی مل جائے مگر سوائے خالی برتنوں شکر اور چاء کے کچھ ملا ہی نہیں۔ بھوک اس شدّت کی تھی کہ سر چکرا رہا تھا۔ ٹول پر پاؤں رکھ کر ہم نے سوچا کہ کیا کرنا چاہئے۔ مگر کوئی بات ذہن میں نہ آئی بیگم کو جگانے کی ہمت نہ تھی۔ مجبوراً بختاور کو ڈھونڈھا۔ بڑی دیر کے بعد پتہ چلا کہ وہ باورچی خانہ کے سامنے والان میں ماؤں کے ساتھ سو رہی ہے مجبوراً پاؤں دبا کر وہیں پہنچ گئے جوانی کی نیندیں ہی بُری ہوتی ہے اور پھر دن بھر کام کاج دوڑ دھوپ کر کے تھکنے کے بعد تو پوچھئے نہیں۔

کچھ ایسی سوئی تھی سونیوالی کہ جاگنا حشر تک قسم تھا

مونڈھا مقام کر دیر تک جھنجھوڑا۔ ہاتھ پکڑ کر کھینچا۔ مگر ہوشیار ہونا کیا معنی ظالم کروٹ بھی لینے کو تیار نہ تھی۔ آخر ہم نے تنگ آ کر ناک کے دونوں نتھنے ہاتھ سے پکڑ لئے۔ سانس جو رکنے لگا تو اُسے کہیں ہوش آیا۔ چونک کر ادہر اُدہر دیکھکر ہم سے مخاطب ہوئی اور خاموشی سے گھورنے لگی۔ ہم نے منہ سے کچھ کہنا مناسب نہ سمجھا۔ ہاتھ پکڑ کر کھینچا کہ وہ اُٹھ کھڑی ہو تو آہستہ سے کھانے کیلئے کہیں مگر ادہر ہم نے ہاتھ کھینچا اور ادہر اُس نے ہاتھ جھٹک کر کسیقدر بلند بلند آواز میں کہا "واہ میاں راتوں کو آ کر جگانا کیا بات بیگم صاحب سنینگی تو غضب ہو جائیگا جا کر سو رہئے!" ہم نے دبی آواز میں کہا "بختاور ذرا اُٹھ تو سہی" اب تو اُس نے اور بھی پاؤں پھیلائے لگی کڑکنے "واہ میاں واہ یہ بھی کوئی بات ہے" ہم نے دیکھا کہ معاملہ اگر بڑھے تو مشکل ہے خاموشی سے واپسی کی ٹھان لی۔ اُس کا ہاتھ چھوڑ کر چلے۔ اب جو پلٹتے ہیں تو دیکھتے کیا ہیں کہ بیگم صاحبہ ہمارے پیچھے پورے جلال کے ساتھ کھڑی ہوئی ہیں۔ چہرہ انگارے کی طرح سُرخ نتھنے پھولے ہوئے آنکھوں سے شعلے نکل رہے ہیں۔ سینہ متلاطم سانس پھولا ہوا ہماری روح ہی فنا ہو گئی۔ کئی ایک آیتیں پڑہیں "جل تو جلال تو آئی بلا کو ٹال تو" کا ورد کیا اور ڈرتے ڈرتے کہا "بیگم!" بس برس ہی تو پڑیں وہ وہ صلواتیں سنائیں ہیں کہ معاذ اللہ۔

شوہر کوئی بیوی کے بس میں

اس قدر جدار آواز تھی کہ سارا گھر جاگ اٹھا۔ ہم نے لاکھ لاکھ کوشش کی کہ کم از کم اپنے کمرے تک پہنچ جائیں مگر ممکن نہ ہوا۔ بیگم نے ایک قدم آگے بڑھنے نہ دیا۔ مامائیں۔ چھوکریاں۔ چھوکرے سب جمع ہو گئے۔ کسی نے یہ اور غضب کیا کہ جا کر ہماری سالیوں اور خوشدامن صاحبہ کو جگا دیا۔ بڑی بی بھی پہنچیں۔ اب گویا ہم ملزم بنے کھڑے تھے۔ مامائیں گواہ تھیں۔ بیگم صاحبہ مدعی اور ہم ملزم بڑی بی نے بختاور تفصیل پوچھی۔ ماماؤں سے گواہی طلب کی بیگم صاحبہ کا بیان سُنا۔ مگر ہمارا ایک لفظ بھی سُننا گوارا نہ ہوا۔ خدا بھلا کرے ہماری منجھلی سالی کا اُس غریب نے سب کو ہٹایا۔ ہم سے پُوچھا کہ ہے کیا قصہ ہم نے بکمال معصومیت آنکھوں میں آنسو بھر کر تمام تفصیل سنائی۔ اس بھولی بھالی لڑکی کو تو یقین آ گیا۔ مگر ہماری بیگم نے باضابطہ جرح شروع کر دی۔ سوال بندی تو ترتیب دے دیا کہ

(۱) اگر بہت بھوک لگ رہی تھی تو ہمیں جگا دیا ہوتا۔

(۲) ہم سے ایسی محبت تھی اور ہماری نیند خراب کرنا پسند نہ تھا تو کسی ماما کو جگا دیا ہوتا۔

(۳) آہستہ سے دبے پاؤں جا کر خاموشی سے بختاور کو جگانا اور اس کے بیدار ہونے پر ہاتھ پکڑ کر کھینچنا کیا بات تھی۔

(۴) اگر کوئی خاص بات نہ تھی تو دندناتے ہوئے آ کر آواز سے جگایا ہوتا۔

اس قدر آہستگی اور کانا پھوسی کیا ضرور تھی"۔

(۵) "اپنا پمپ شوز نہ پہننا اور ہمارا سلیپر سونے کے کمرے میں سے لیکر پہننا کیا ضرور تھا"۔

(۶) "کندھے پر تو ال ڈالکر بختاور کے پاس آنا کیا بات۔ ورنہ غسل خانہ کو بھی خود تو ال لیجانے کی عادت نہ تھی"۔

(۷) "بختاور کو جگانے کے بعد بجائے کھانا لانے کے لئے کہنے کے اٹھنے کی فرمائش کرنا کیا بات ہے"؟

(۸) "آواز دیکر جگانے یا جھنجوڑنے کے بجائے نتھنے پکڑ کر جگانا کیسا"؟

(۹) "دلاور نے دروازہ کھولا تو اسی کو کھانا لانے کیلئے کیوں نہ کہدیا؟ بختاور کے پاس آنا کیا ضرور تھا"۔

یہ سوالات ایسے نہ تھے کہ ہم بلا کسی بیرسٹر یا جوڈیشل کامیاب وکیل درجۂ اوّل یا ال ال بی، کی امداد کے جواب دیکتے۔ ہم نے منجھلی سالی کے کمرے کا رُخ کیا اور اُسکی چارپائی پر گر کر اپنی معصومیت پر اشکباری شروع کی۔ سحر کی ٹھنڈی ہوا نے خالی معدے اور تھکے ہوئے دماغ کو کچھ اسقدر متاثر کیا کہ نیند آگئی۔

بوکھلاہٹ

گذشتہ صبح کو ہم سویرے ناشتہ کرکے گھر سے نکلے، ملتے ملاتے پھرتے پھراتے بارہ بجے مکتبہ ابراہیمیہ پہونچے گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ عبد الحق سے گپ لڑائی اور پھر چلے طرف قطبی گوڑے کے، چونکہ ہم روزانہ دفتر جانے کیلئے آٹھ ساڑھے آٹھ بجے ناشتہ کرتے اور بڑی بے دردی سے خوب ڈٹ ناشتہ ہوتا تھا۔ اسلئے دفتر میں ڈیڑھ دو بجے تک بھوک نہیں لگتی تھی۔ مگر تعطیل کے روز چونکہ دوپہر کا کھانا گھر پر کھانے کا اتفاق ہوتا اس لئے ہم ناشتہ بھی ذرا معمولی اور یونہی سا بقدر بادام یعنی صرف ایک پراٹھا، آدھ پاؤ کھچڑی معہ سالن کھالیا کرتے تھے اور فقط ایک عدد پیالی پی جاتے اور سات بجے تک تیار ہو کر گھر سے چلے جاتے تھے اس لئے راستہ میں لگنے لگی بھوک ہم نے کہا آؤ ذرا چائے پی لیں، "بمبئی رسٹارنٹ" میں پہونچکر چائے پی کچھ بسکٹ کھائے اور پھر سائکل سنبھالی تو سیدھے "حافظ جی" کے مکان پہ جا ٹھہرے کئی روز کے بعد ملاقات ہوئی تھی۔

ادھر اودھر کی باتیں، شکوے شکایت، طنز، چوٹ، مذاق، دلگی، سبھی کچھ ہوتا رہا حتیٰ کہ بج گئے ساڑھے چار! ہم نے سوچا کہ کھانے کا وقت تو گیا اب گھر جا کر کھانا کھائیں گے تو پوچھ گوچھ ہوگی کہ اب تک کہاں رہے دیر کیوں لگائی وقت پر کیوں نہیں آئے؟ لہٰذا اس سے بہتر یہی ہے کہ رات ہی کو گھر پہونچکر کھانا کھائیں اور دوپہر کے کھانے کے واسطے یہ کہکر ٹال دیں کہ عبدالحق نے مجبور کرکے کھانا کھلا دیا، یہی سوچکر ہم نے پانچ بجے بمبئی رسٹورنٹ میں چائے بھی پی لی اور پہونچ گئے مکتبہ ابراہیمیہ وہاں دیکھتے کیا ہیں کہ "مخزن کا افسانہ نمبر" اسٹال پر رکھا ہوا ہے اب جو خوشی خوشی ہم نے رسالہ لیکر دیکھا تو سب سے پہلے ہمارے مشترکہ ترجمے "ارنسٹ" پر تنقید نظر آئی شروع سے اخیر تک پڑھ ڈالا ایک نہیں دو دو بار دیکھا مگر سوائے برائیوں کے اچھائیاں نظر ہی نہیں آئیں میاں تاثیر[1] نے فقط معائب ہی معائب گنائے تھے اور آخر میں یہ ٹک لکھ دیا کہ "کتاب تک پھینک دی" ہم نے کہا چلو یہی غنیمت کہ تاثیر صاحب نے کتاب پڑھ کر پھینکی بات دراصل یہ ہے کہ اردو مرکز والے اب ذرا سمجھنے لگے ہیں۔ اپنے تئیں "یا آپ نے سمجھے ہوئے ہیں"۔

آسکر وائیلڈ کی نثر انگریزی میں وہی درجہ رکھتی ہے جو میر انیس کی نظم کو اردو میں حاصل ہے اگر کوئی شخص میر انیس کے مراثی کا ترجمہ انگریزی

---

[1] محمد دین صاحب تاثیر ایم اے

میں کرے تو کیا اصل کا لطف باقی رہے گا؟ مطلق نہیں! طرز بیان کی ایک خصوصیت اور تشبیہ و استعارات کی لطافت ایک حد تک معلوم ہو سکیگی اور بس یہی حال اسکر وائیلڈ کے ڈراموں کا ہے اُدھر انہیں اُردایا (اردو میں ترجمہ کیا) اور اِدھر لطافت غائب پھر آپ ہی کہئے ہم اصل کی خوبی کہانتک باقی رکھ سکتے تھے خیر یہ تو ایک جملہ معترضہ تھا مگر ہمیں مسرت ضرور ہوئی کہ تاثیر صاحب نے اس کا مطالعہ اصل کو پیش نظر رکھکر کیا ہے اس تنقید کو ختم کر کے افسانوں پر پہونچتے ہیں تو بس امتلا اور سخت امتلا شروع ہو جاتا ہے کوئی ناظمی صاحب خیر سے ایم اے بھی ہیں اور روسی افسانے کو ہندوستانی فضا میں ترجمہ کرتے ہیں۔ مگر واہ ری تاثیر کی آپ بُرا تو نہیں منائیں گے" اور تم جوان مجھیرے ہر گز نہیں میں بھی خاموشی پسند ہوں ہا تو نی ہر گز نہیں" میکسم نے امن کا سانس لیا کوئی بڑا جرم کیا ہے تم نے جو یوں خاموش ہر وقت ضمیر کی ملامتیں سنتے رہتے ہو، ہیں یہ کہکر خوشی خوشی بستر میں جا کود "گم ہو جاؤ نہیں اٹھا کر باہر پھینک دوں گا" رفیق اطاق" کیا کیا ترکیبیں گنواؤں بقول مرحوم مہدی کے "امتلائے ادبی" پیدا ہونے لگا۔ اور ہمنے یہ جملے سنائے مکتبہ ابراہیمیہ کے منیجر عبد الحق صاحب کو گو آدمی ذرا سیدھے سادھے ہیں اور فی الجملہ سادہ لوح بھی واقع ہوئے ہیں مگر ایک بات ضرور پتے کی کہی کہ "بھئی لوگوں کو اپنی آنکھ کا شہتیر نظر نہیں آتا۔ مگر روڑتے ہیں دوسروں کی۔

آنکھ کا تنکا نکالنے ڈھائی صفحے کے ترجمہ میں ایک ایم اے نے معمولی جملوں کے لکھنے
میں اتنی بدحواسیاں کیں مگر پروفیسر تاثیر یا حضرتِ حفیظ کو نظر ہی نہیں آئیں
اور جو تم نے سوا سو صفحے کی ادبی ادق اور اہم کتاب کے ترجمے میں اگر غلطیاں
کیں تو بس سر ہو گئے" ہمنے کہا میاں جانے بھی دو ایسا ہوا ہی کرتا ہے یہ باتیں
ہو ہی رہی تھیں کہ حضرت مولوی محمد عبدالوہاب صاحب قبلہ ڈاڑھی کھجلاتے
اور توند ہلاتے ہوئے آہی پہونچے پھر کیا تھا گپ شروع ہو گئی۔ اسی اثناء
میں چراغ علی صاحب بھی ہانپتے ہوئے بٹوا سنبھال کر آدھمکے اور طائفہ
وزوانِ عرب کے ارکان اربعہ نے وہ وہ گپیں اڑائیں کہ واہ میاں باقر علی
داستان گو کی روح بھی شرما گئی ہو گی۔ اسی گپ بازی میں ساڑھے سات
بج گئے، چراغ علی ٹھہرے "وہ" یعنی بمحاورۂ عوام زن مرید" سائیکل سنبھالکر
سیدھے گھر کی طرف جاتے رہے اور ہمیں وہاب نے دعوت دیدی، ہم نے بھی
عبدالحق کے اصرار پر دعوت قبول کر لی اور چلے طرف نام پلی کے پیٹ بھر کھایا
اور پھر لب بند، لب سوز، لب ریز، چائے پی اور ساڑھے آٹھ بجے واپس
ہوئے۔ مالگزاری کے سامنے پہونچکر عبدالحق چلتے بنے اب صرف رہ گئے ہم
دونوں یعنی وہاب اور راقم جانب! وہاب نے کھانا ہضم کرنے کی ترکیب
یہ نکالی کہ شاہ صاحب[1] کے پاس چلیں اور وہاں مرزا صاحب کے مزاج

---

[1] شاہ عبدالقادر صاحب خلف نواب جعفر یار جنگ بہادر

پوچھیں ہم دل میں تو ڈر رہے تھے کہ نہ جانے، گھر جانے کے بعد کیا گت بنتی ہے
مگر ہمت کر کے شاہ صاحب کے پاس چلنے کی ٹھان لی اور وہیں پہونچے مرزا صاحب
پاندان لئے براجمان تھے۔ شاہ صاحب بھی تشریف فرماتے تھے، نظامی صاحب
بھی موجود تھے۔ ہمارے پہونچتے ہی جلسہ کا ملہ مکمل ہو گیا اور سب ملکر ہل پڑے
مرزا صاحب پے! مرزا صاحب کی مختصر تعریف یہ ہے کہ پرانی دلّی میں پیدا ہوئے
دیسی ریاستوں اور خاصکر رامپور میں جوانی گذاری اور پھر دکن آکر نوکری کرلی
ابتدا تلنگانہ میں رہے پھر حیدر آباد میں قیام فرمایا چار شادیاں کیں پہلی بیوی
میرزا صاحب سے ڈیوڑھی عمر کی چھ بچوں والی ملی جسوقت مرزا صاحب سے
نکاح ہوا تو اُن محترمہ کے بڑے صاحبزادے جو مرزا صاحب ہی کے ہم عمر تھے
تکمیل تعلیم کیلئے یورپ جا رہے تھے۔ دوسری شادی بھی ایک چار بچوں
والی ہی سے کی اور تیسری چوتھی بھی، میر منشی گیری رزیڈنسی سے لیکر آبکاری
کی داروغہ گیری اور محبس (جیل) کی محرری تک کی مگر پاؤں میں چکر تھا کہیں
ٹکے نہیں سن شریف ستر کے قریب ہے بال سفید ہو گئے ہیں جسم خاصا
بھاری بھر کم ہے رنگ بھی سُرخ و سفید پایا ہے۔ خضاب لگا کر اب بھی مونچھ
چڑھائے پھرتے ہیں۔ اس حالت میں بھی جوانوں سے گئے گذرے نہیں۔
کسی بات کا تذکرہ ہو بینک سے چونک کر خود بھی شریک ہو جاتے ہیں وہی
روز پہلے میرزا صاحب نے نواب معین یار جنگ کے پاس عوت اڑائی تھی

اور اب بیٹھے اسی کا تذکرہ کر رہے تھے حق تو یہ ہے کہ حقِ نمک خواری ادا کرتے تھے تعریفوں کے پل باندھ رہے تھے ہم جو پہنچے تو ساری شیخی کرکری ہوگئی۔ لگے بغلیں جھانکنے گو مذاق کرنا جانتے نہیں۔ مگر بامذاقوں کی صحبت ضرور ملی ہے اور اسی برتے پر چند خاص خاص جملے بول بھی لیتے ہیں مگر وہاں میں رہ رہ کر زباں اس قدر خراب ہوگئی کہ لاحول ولا قوۃ ، ساڑھے گیارہ بجے رات تک سبھوں نے میرزا صاحب کو ستایا۔ بیچارے دن بھر کے تھکے ہوئے افیون کھا کر سونا چاہتے تھے گھڑی گھڑی پینک میں چلے جاتے تھے ادھر انہوں نے آنکھیں بند کرکے غوطہ لگایا اور ادھر سبھوں نے چیخا "بُرقی بُرقی" جھٹ میرزا صاحب چونک پڑے اور لگے اناپ شناپ بکنے۔

ٹھیک بارہ بجے ہم ٹیلیفون ایکسچینج کے پاس پہنچے نہایت تیزی کیساتھ چلے جا رہے تھے کہ کسی نے پیچھے سے آواز دی اب جو پلٹ کر دیکھتے ہیں تو مولوی سردار علی صاحب مدیر رسالہ تجلّی سہ ماہی (جو تقریباً ایک سال سے زیر اشاعت اور آدھے سے زیادہ لکھا جا کر رکھا ہوا ہے[1]) ڈنڈا ہاتھ میں لئے جھومتے ہوئے آ رہے ہیں مولوی صاحب اتفاق سے ہمارے استاد بھی واقع ہوئے ہیں اور والدِ مرحوم کے شاگرد بھی اور پھر علمی ادبی آدمی بھی اب اگر ہم نہ ٹھہرتے تو مشکل تھی مجبوراً سائیکل سے اتر کر ملنا پڑا، ادبی دنیا، نیرنگِ خیال،

---

[1] افسوس ہے کہ رسالۂ تجلی کا یہ آخری پرچہ تھا اس کے بعد قصہ ہی ختم ہوگیا۔

نگار، سے لیکر معارف تک کے متعلق آپ نے پوچھ لیا اور پھر یہ یک سالانس
رہبر دکن، مشیر دکن، صحیفہ، صبح دکن، نظام گزٹ، دکن گزٹ[1]، دکن پنچ سے
لیکر الحمایتہ تک کے متعلق فرما دیا اور ساتھ ہی ساتھ اپنے رسالے کی اشاعت
کا تذکرہ، کاپی نویسوں کی شکایت مطبع کی مذمت بھی فرماتے رہے بہر حال
گول بنگلہ سے سوکھے حوض تک حضرت نے خراماں خراماں چلتے ہوئے دنیا
بھر کی باتیں کیں اور پھر کچھ نہیں ہمنے اہنیں رخصت کرکے چار مینار کی گھڑیال
پر نظر ڈالی تو چھوٹا کانٹا بارہ اور ایک کے درمیان میں نظر آیا اور بڑا کانٹا فقط
دس پر یعنے ایک بجنے کیلئے صرف دس منٹ باقی تھے، ہمنے سائیکل پر سوار ہوکر
بھاگنا شروع کیا تو سیدھے گھر پہونچ کر دم لیا۔ پھاٹک کے سامنے سائیکل کو
دیوار سے ٹیکا دیکر کھڑا کر دیا اور بڑی دقت سے ہاتھ ڈالکر پھاٹک کھولا مگر ہاتھ
پر بندھی ہوئی گھڑیال کا آئینہ شہید ہوگیا اور اندر جا کر پھاٹک بند کیا اور
دیوان خانے کے دروازہ کو بھی ہاتھ ڈالکر کھولنے کی کوشش کی بڑی دقت
کے بعد دروازہ کھلا اور ہم نے دالان میں سائیکل رکھکر جل تو جلال تو آئی بلا کو
ٹال تو، پڑھتے ہوئے دبکتے دبکاتے ڈرتے سہمتے اندر کا رخ کیا، صحن میں پہنچکر
دیکھتے کیا ہیں کہ ہمارے کمرے میں خاصی روشنی ہے چراغ جل رہا ہے بیگم صاحبہ
لکھنے کے میز کے سامنے بیٹھی ہوئی کچھ پڑھ رہی ہیں بس ہمارے اوسان تو

---

[1] یہ روزنامہ بھی چند ہی دن جاری رہ کر بند ہوگیا۔

خطا ہو گئے۔ ہمنے کہا کہ آج خیر نہیں۔ پھر یہ سوچا کہ آہستہ سے پیچھے جا کر دونوں
ہاتھوں سے آنکھیں بند کر دیں گے۔ اس مذاق ہی سے سہی مگر ذرا غصہ تو ٹھنڈا
پڑیگا۔ مگر مشکل یہ تھی کہ پاؤں میں اڑی وار شوز تھا۔ ہم نے اس خیال سے کہ
آواز ہو گی اس کو اُتار کر صحن ہی میں چھوڑ دیا اور ننگے پاؤں دبکتے دبکتے کمرے کے
پچھلے دروازہ سے داخل ہونا چاہا، ہائے دنیا کی بدترین چیز موز ہے صورتاً برا
مزا خراب، خاصیت خراب، مضر صحت، قابض جانے کیا اور کیا اور پھر اس
بُرے میوے کے چھلکے (پوست) بھی تکلیف دہ! نہ جانے کس نے موز (کیلے)
کھا کر سیڑھیوں پر چھلکے (پوست) پھینک دیئے تھے کہ ہمارا سیدھا پاؤں
اسی پر پڑا اور ابھی ہم سنبھلنے نہ پائے تھے کہ دھڑام سے دروازے میں گر پڑے
پردا لٹک رہا تھا بدحواسی میں ہم نے اسی کو تھامنا چاہا تو وہ بھی سر پر آرہا۔
اب ہماری ہیئت کذائی ایک گٹھری سی بن گئی اور ہم پردے میں لپٹے لگے لوٹنے ادھر
جو بیگم صاحبہ نے دروازہ میں سے کسی گٹھری کو گر کر حرکت کرتے دیکھا تو انکے
ہاتھ پاؤں بھی سرد ہو گئے، زور سے چیخ کر دونوں ہاتھ آنکھوں پر رکھ لئے ادھر
چیخ کی آواز پر سب لوگ جاگ پڑے، بختاور ایک طرف سے دوڑی۔ انا بھی
آنکھیں ملتی ہوئی آگئی۔ کاماٹن نے بھی کمرے کا رخ کیا، بختاور کمرے میں داخل
ہوئی ہی تھی کہ ہم اُٹھ بیٹھے مگر پاؤں ابھی پردے میں اُلجھے ہوئے تھے۔ ہمیں
اس حالت میں دیکھ کر اس لونڈیا کو بھی بے اختیار ہنسی آگئی اور وہ لگی کھل کھلا کر

ہنستے اس آواز پر بیگم صاحبہ نے ایک ہاتھ آنکھ پر سے ہٹا کر جو ملاحظہ فرمایا تو
ہم گھٹنوں کے بل کھڑے ہوئے اور بختاور ہنستی ہوئی نظر آئی، بس اب کیا تھا
غریب بختاور کی شامت ہی تو آگئی فونٹن پن سوال آنک کی شیشی میز پر سے
اٹھا کر بختاور پر کھینچ ماری مگر اتفاق سے وہ تو بچ گئی لیکن شیشی دیوار پر لگ کر
ٹوٹ گئی اور روشنائی دیوار سے اچھل کر ہمارے منہ سر اور چھاتے پر افشاں کی
صورت میں آرہی۔ بال بھی سرخ ہو گئے اور گال پیشانی آنکھ، ناک بھی لال لال
لال ہو گئے تھوڑی دیر پہلے تک مارے ڈر کے ہمارا بُرا حال تھا مگر اب ہمیں
بھی غصہ آگیا اور ہمنے بھی یہی سمجھا کہ کچھ ہو آج بیگم صاحبہ کو کم از کم دو تمانچے
رسید کر دینے چاہئیں ہم اس مارنے کے ارادے یا مارنے کے خیال یا مارنیکی
غرض سے یا مارنے یا مارے جیسا کرنے یا مارنے کی نیت سے ابھی قدم بھی
اٹھانے نہیں پائے تھے کہ انّا نے کمرے میں قدم رکھا اور ہمیں سر سے پاؤں
تک سُرخ سُرخ دیکھ کر اُسے خون کا شبہہ ہو گیا اور وہ لگی چیخنے" ہائے دولھے
پاشا وائے دولھے پاشا اللہ اللہ منہ سب خون میں بھر گیا منہ سب خونا خون
ہو گیا۔ اس منظر کو کاماٹن نے دیکھا تو اُسے کچھ اور تو سوجھا نہیں لگی وہ ڈاڑھیں
مار مار کر رونے اس تعزیہ داری کی شرکت کیلئے گھر بھر کی حاضری ضروری تھی
ہماری دونوں سالیاں اپنے اپنے کمروں سے دوڑتی ہوئی آئیں ممانی (خوشدامن)
بھی ہانپتی ہوئی آپہونچیں، اور پھر ماموں جان بھی پریشاں مُو ارگنگ (تہمد)

باندھے کنٹوپ اوڑھے ٹھوڑی کے نیچے ہیٹ کی تسمے کی طرح کنٹوپ کے
بند باندھے ہوئے سرہانے سے پیش قبض اٹھا کر آپہونچے، مامائیں بھی جاگ
پڑھیں۔ ہمارے کمرے میں پہونچکر بڑے میاں نے انتہائی سراسیمگی سے پوچھا
کیا ہوا بیٹا؟ ہم اس میں شک نہیں بوکھلائے ہوئے ضرور تھے مگر واقعہ بیان
کرنے کے سوا چارہ کیا تھا ہم نے کہا جی کچھ نہیں سرخ روشنائی گر گئی بڑے
میاں نے آگے بڑھکر غور سے چہرے کو دیکھا اور نہایت ہی متانت سے پوچھا
وہ کس طرح اب ہمنے بکمال مظلومیت سارا قصہ سنایا کہ ہم پچھلے دروازے سے
اس طرح آرہے تھے اور یوں پاؤں پھسلا اور ہم پردے میں لپٹ کر
اس طرح گرے اور بیگم صاحبہ نے چونک کر ایسی چیخ ماری اور بختاور یوں
دوڑتی ہوئی آئی اور اس طرح ہم اٹھ رہے تھے کہ وہ ہنسنے لگی اس پر خفا
ہو کر بیگم نے یوں سیاہی کی شیشی پھینکی اور وہ شیشی دیوار پر یہاں لگ کر ٹوٹی
اور اسکی سیاہی یا سرخی یا روشنائی اس طرح ہماری سرخروئی کا باعث
ہوئی اور اناں نے خواہ مخواہ رونا شروع کیا" بڑے میاں تو خیر سارا قصہ
خاموشی سے سنکر مسکراتے ہوئے پلٹ گئے مگر دونوں لڑکیوں (سالیوں)
نے ہنسنا شروع کیا اور بڑی بی نے دونوں ہاتھوں سے چٹ چٹ بلائیں لیکر
سیکڑوں دعائیں دیں اور لگیں تحقیقات کرنے کہ کس نے موز کا چھلکا
سیڑھیوں پر پھینکا وہ تو ہم نے ہوشیاری کی جو بڑی بی کو باتوں میں لگا کر

دالان تک پہونچادیا ورنہ صبح تک بھی موز کے چھلکے کی تحقیقات ختم نہ ہوتی ہمارے واپس آتے ہی دونوں سالیوں نے انگلیاں مٹکا مٹکا کر گانا شروع کیا ع ہم بھی لہو لگا کے شہیدوں میں مل گئے۔

ہمنے ان شیطانیوں سے پیچھا چھڑانا ہی مناسب جانا اور آہستہ سے غسل خانے کی راہ لی، وہاں پہنچکر شیروانی اتاری، صابون لگا لگا کر سر اور منہ دھونا شروع کیا۔ سر تو صاف ہو گیا مگر سرخروئی نہ گئی، لال لال دھبّے گالوں اور پیشانی پر باقی رہ گئے۔ صابون سے بیسن نے گھسنی سے ہر چیز سے رگڑ رگڑ کر ان دھبوں کو نکالنے کی کوشش کی لیکن ؎

سرخی کے نشان گئے نہ رُخ سے
ناحق دو گھنٹے شست وشو کی

آخر تھک کر ہم نے یہ شست وشو ختم کی اور کمرے میں آکر دیکھا تو بیگم صاحبہ بڑے ٹھسّے سے تیوری چڑھائے پیشانی پر ہزاروں شکن ڈالے ایک ہاتھ کمر پہ اور دوسرا میز پر رکھے ہوئے ہمیں گھور رہی تھیں مارے غصّے کے کندنی رنگ اور چمک اٹھا تھا۔ سانس زور زور سے لے رہی تھیں سینے کا تموّج بھی بڑھ گیا تھا۔ اس مد وجزر ،، کو دیکھ کر ہم ساری کلفت بھول گئے بے تحاشا آگے بڑھکر......... بس غضب ہی ہو گیا وہ تو صبح سے بھری بیٹھی تھیں برس پڑیں اور لگیں لتھاڑنے گویا ہتیار موزی کی اصطلاح میں

مذاکرۂ علمیہ بپا ہو گیا۔

"بس دور ہی رہو صبح ساڑھے سات بجے سے گئے ہوئے آئے ہیں رات کے دو بجے غضب خدا کا اکیس گھنٹے مزے میں گزار دیئے اور خیر ہوئی بیوفائی کی انتہا بھی ہے ہمنے آپکے کارن آپا بسرا دیا مگر آپ ہیں کہ دوستوں میں گرفتار نہ جانے کہاں کہاں مارے مارے پھرتے رہے کہ صبح کے گئے اب آرہے ہیں اور آئے بھی تو اس مردار بجاور کے پاس نہ جانے کب سے پڑے ہوئے تھے جب جی بھر گیا تو اُسنے لیکر میرے پاس وارد ہوتے ہیں۔ اللہ اللہ اس نکٹی کلموہی سے نہ جانے کیا محبت ہو گئی ہے کہ دن رات اسی کا کلمہ پڑھا جاتا ہے صبح سے شام تک بس بجاور کا وظیفہ ہے کام کہیں گے تو بجاور کو ہنسیں گے تو اسی کے ساتھ گھل مل کر باتیں ہونگی تو اسی سے انعام دیں گے تو اسی کو تعریف ہوگی تو اسی کی تائید کرینگے تو اسی کی میں کہتی ہوں کہ آخر اس سے ایسی ہی مُحبّت ہے تو نکاح کیوں نہیں کر لیتے اسی کو ساتھ لیکر خوشی خوشی زندگی بسر کرو اور خوش رہو میں منع تھوڑا ہی کرتی ہوں تم باندیوں ہی سے خوش ہو تو انہیں کے ساتھ رہو کہنے والا کون ہے، پرسوں خالہ امّاں کے ہاں نیاز میں جاتی ہوئی میں اس مردار کو بھی ساتھ لئے جارہی تھی۔ امّا جان نے ناحق روکا اب جو واپس آکر دیکھتی ہوں تو اور ہی عالم ہے کلموہی نکٹی مردار بٹیاں سنوارے اچھلتی کودتی پھر رہی ہے اس کے انداز دیکھتے ہی میرا ماتھا ٹھنکا کہ کچھ نہ کچھ

بھید ہے اب جو کمرے میں آکر دیکھتی ہوں تو پلنگ پوش پر سلوٹیں پڑی ہوئی ہیں سرہانے کے تکیئے میں اس مُردار کے سر کے ناریل کے تیل کی بو بسی ہوئی ہے. کمرے کی چاندنی پر اس کے پاؤں کے بیسوں چھاپے پڑے ہوئے ہیں میں گئی تھی بارہ بجے اور آپ صبح کچہری جا چکے تھے آکر دیکھتی ہوں تو تھی نہیں میرا یہ خیال ہوا کہ ابھی کچہری سے آئے نہ ہونگے وہی مُردار آکر لوٹی ہوگی مگر رستم سے پوچھتی ہوں تو پتہ چلتا ہے کہ حضور دو بجے تشریف بھی لائے تھے۔ پانچ بجے تک کمرہ بند کئے......... رہے میرے آنے سے پہلے باہر تشریف لیگئے اور پھر سب کو منع بھی کر دیا کہ دیکھو گھر آنے کی اطلاع بیگم صاحبہ کو نہ دینا، رات کے نو بجے آتے ہیں تو ایسے غریب جیسے کچھ جانتے ہی نہیں نہ تو اپنے آنے کا تذکرہ کرتے ہیں اور نہ میرے جانے کی وجہ پوچھتے ہیں اور میں جو نیاز میں جانے کا قصّہ سناتی ہوں تو حضور کو تعجب بھی ہوتا ہے۔ اچھا تم ہو آئیں، کہکر اظہار تعجب بھی کرتے ہیں، اُف رے تیری عیاری خدا نے مرد بنایا سو یہ حال ہے۔ اگر عورت ہوتے تو نہ معلوم "کلیو پیٹرا" کا نام زندہ کرتے کہ "سلومی" کے جانشین ہوتے پیرزن، فرہادکش، بنتے کہ عورت ڈلا کہلاتے،،

گذشتہ جمعرات کو دن بھر غائب رہے رات بھر غائب رہے جمعہ کے روز تشریف لاتے ہیں تو اس ہیئت کذائی سے کہ شیروانی میلی قمیص اور پاجامے پر رنگ برنگ کے دھبے چہرا اترا ہوا، آنکھیں سرخ سرخ خمار آلودہ، ہونٹوں پر

پیٹریاں جمی ہوئیں چلتے ہیں تو عجیب انداز سے ایک طرف قدم رکھتے ہیں
تو ایک طرف پڑتا ہے کہنا کچھ چاہتے ہیں منہ سے نکلتا کچھ ہے آتے ہی غسل کیا
اور پھر پڑ کر سو رہے تو چار بجے تک۔ جب کہیں آدمی نے پوچھا تو وہی کہا کہ
دوستوں نے مجبور کر کے اپنے ساتھ حمایت ساگر کھینچ لیا تھا رات بھر جاگتے رہے
نیند کا خمار تھا۔ اسی لئے آکر سو رہا، مجھے اس پر بھی شبہ نہیں ہوا، دستی سونگھتی
ہوں تو اس میں مصالحہ کی بو بسی ہوئی، بیچارے اُن کے دوست مصالحہ شیروانی
میں ملتے ہوں گے۔ یا ڈاڑھی مصالحہ سے دھوتے ہونگے پوچھا تو کہا کہ
عبد الحق کا بچہ منظور انّا کی گود میں بیٹھا میری دستی سے دیر تک کھیلتا رہا اسی انّا
کے سر کے مصالحہ کی بو ہو گی بھلا غور کرنے کی بات ہے کہیں انائیں ماما ئیں بھی
سر میں مصالحہ اور عمر خیام آئل ڈالتی ہیں۔ جو دستی میں بو بسے، اس پر بھی میں خاموش
ہو رہی مگر پرسوں معلوم ہوا کہ حضرت نے اپنے "دزدانِ عرب" یعنے دوستوں کے
ساتھ جلسہ منایا ہے خدا اِن دوستوں سے سمجھے وہ بیچارے مولوی[1] صاحب
کتنی مقدس صورت کے بزرگ ہیں۔ ڈاڑھی دار آدمی ٹخنوں سے اُوپر پاجامہ
شرعی مونچھیں شریفانہ، صورت بالکل مُولویانہ مگر کُن چال ایسے کہ بس کہے
نہ جا سکیں، سنا کہ بیچارے صبح چھ بجے گھر سے نکل کر رات کے بارہ بجے پہونچتے
ہیں اور بیچ میں بھٹک کر نہیں دیکھتے بیچاری بیوی گھر میں پڑی کڑھا کرتی ہے

[1] مولوی عبدالوہاب

دھوپ ہو، بارش ہو جاڑا ہو کچھ ہو مگر مولوی صاحب کے اس معمول میں فرق نہیں آتا، یہ بھی کوئی زندگی ہے وہ عبدالحق صاحب اتنی بڑی فرم کے مہتمم ہیں سنتی ہونگہ بڑے منتظم اور بیوپاری دماغ کے آدمی ہیں اور پھر بیوی سے بھی ڈرتے ہیں مگر ان لوگوں کا ساتھ دینے سے باز نہیں آتے اسی محبت نے ان کی مٹی بھی پلید کی عبدالرحمن تو آپ کے بچپن کے ساتھی ہیں مگر اب کچھ ان کا ساتھ چھوٹ رہا ہے۔ بیچارے نہایت کم سخن منکسر مزاج غریب طبیعت کے آدمی ہیں گھر سے نکلے دفتر گئے اور دفتر سے نکلکر سنیما پہونچے پھر گھر جا کر پڑ رہے۔ مگر کبھی کبھار بڑی سرگرمی سے انکی پارٹیوں میں شریک ہو جاتے ہیں۔ شاہ صاحب بیچارے اللہ والے آدمی ہیں مگر ان کو بھی رنگ پر لانے کی کوششیں ہو رہی ہیں میرزا صاحب ہیں کہ بھڑکا رہے ہیں۔ غضب خدا کا بیچاروں کے پاس بارہ بارہ ایک ایک بجے رات تک بیٹھتے ہیں وہ بیچارے بھی مارے مروت کے کچھ نہیں کہتے، اگر یہی لیل و نہار رہے تو شاہ صاحب کا یہ تقدس بھی کوئی دن کا مہمان ہے وہ بھی ایک نہ ایک دن رنگ پر آہی جائیں گے، میں پوچھتی ہوں کہ آخر آپ لوگوں کو ہو کیا گیا سب کے سب شریف پڑھے لکھے تعلیم یافتہ اور یہ حرکات آپ ہیں کہ بلا کسی خوف کے جلسے اڑا رہے ہیں کل ہی کی بات ہے رمضان کی ۲۶ تاریخ کی رات کو جلسہ کیا اللہ اللہ کیسے دن اور آپ لوگ ہیں کہ جلسے مناتے ہیں گانے سنتے ہیں مجھ سے کہا کہ غیاث کے لڑکے کی بسم اللہ ہے دعوت میں جائیں گے صبح

نہایت غربت سے آکر سو رہے کہنے لگے رات ذرا جاگا تھا تھوڑی دیر قوالی ہوئی مگر بعد میں معلوم ہوا کہ قوالی نہیں اس شور اپروالی کا گانا تھا۔ گن چال ایسے اور پھر دیکھئے تو سولا تا آ وہ مضمون لکھیں گے کہ واہ جیسے کوئی بڑا ہی مقدس سید سلیمان یا عبدالباری فرنگی محلی بیٹھا لکھ رہا ہو دوسرے کی خانگی زندگی پر اعتراض کرینگے اوروں کے عیب گنتے پھرینگے مگر اپنے گریبان میں سر ڈال کر نہیں دیکھینگے ۔

کسی نے اونٹ سے پوچھا تیری گردن کیوں خم ہے

تو بولا کون سا عضو میرا شمشاد سے کم ہے

خدا کی مار اس گندم نما جو فروشی پر،

ظاہر میں آدمی تو بڑے شاندار ہیں

اسوقت بیگم صاحبہ کا پارہ ایکسو پندرہ سے بھی کچھ اونچا ہو چلا تھا۔ ہمیں خوف یہ تھا کہ کہیں حملہ آور نہ ہوں مگر خیر یہ گذری کہ ابھی وہ رجسٹر خوانی کر رہی تھیں کہ اذان کی آواز آنے لگی" الصلوٰۃ خیر من النوم" کو ہم نے دہرانے کے بجائے" الصلوٰۃ خیر من الغضب" کو تین تین چار چار دفعہ دہرانا شروع کیا اور دوڑ کر سیدھے غسل خانہ پہونچ گئے وضو کیا اور کمرے میں آکر جانماز بچھائی اور نماز شروع کردی مگر بیگم صاحبہ اسی انداز سے بیٹھی رہیں ہمنے نماز کے بعد دعا مانگنی شروع کی کہ خداوندا! بیوی کے غصے سے بچا" پروردگارا! گھر داماد کی لعنت سے نجات دیجیو" مالکا! ان ازدواجی زنجیروں سے چھڑائیو" خدایا

موت دیکھو کہ مر کر پیچھا چھوٹے۔ یا گیارہ ہزار روپیہ دیکھو کہ مہر ادا کر کے اس بلا سے نجات پاؤں ابھی ہم نے دعا ختم بھی نہیں کی تھی کہ اثرِ اجابت ظاہر ہونے لگا بیگم صاحبہ کھل کھلا کر ہنس پڑیں اور کہنے لگیں اجی مہر کیوں ادا کرتے ہو لو میں معاف کئے دیتی ہوں کہو تو لکھدوں کہ میں نے مہر بخشا چلو اب تو خوش ہوئے نجات مل گئی مہر سے اب رہی تمہاری نجات و رسو میں نے اسے بھی آزاد کیا خوشی سے لیلو چلو چھٹی ہوئی۔ دوستوں کے ساتھ مزے سے رہو اب جو ہمنے انہیں دیکھا تو اور ہی عالم تھا لیمپ کی روشنی پھیکی پڑ چکی تھی صبح کی سفیدی میں نا فرجانی ساڑھی عجب بہار دے رہی تھی انکا مسکرا مسکرا کر باتیں کرنا غضب ڈھا رہا تھا ہم نے جانماز سے اٹھکر بے تحاشا.......... اور پھر نہایت ہی پھرتی سے انہیں کرسی پر سے اٹھا لیا کمرے میں پہونچکر چارپائی پر لیٹے ہی تھے کہ بیگم صاحبہ نے پھر شکوے شکایتوں کا دفتر کھولنا شروع کیا۔ مگر دن بھر کی گردش رات بھر کی بیداری اور کوفت نے اس قدر تھکا دیا تھا کہ بادِ سحر کے دو ہی جھونکوں میں ہم فنا فی النوم ہو گئے شاید ہمیں سوتا پا کر وہ بھی سو گئیں دوسرے روز ہم بیدار ہوتے ہیں تو دن کے ڈیڑھ بجے ہائے کتنے مزے کی نیند تھی ہمنے اٹھکر انہیں بھی جگا دیا دونوں نے اٹھکر ضروریات سے فراغت حاصل کی ناشتہ کیا وہ جا کر اپنی بہنوں کے پاس بیٹھ رہیں اور ہم تگے انکشاف کیلئے مضمون لکھنے ہائے ے

زندگی جو رو سے لڑ لڑ کے گذارینگے تو پھر ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

مضمون کیسے لکھتے ہیں

"لکھنا، یا لکھنے کا ارادہ کرنا، یا لکھنے کے خیال سے قلم اٹھانا، یا کاغذ کھینچنا
یا کوئی حرکتِ اضطراری یا غیر اضطراری ایسی کرنا جس سے "لکھنا" ظاہر ہو، جرم ہے،
ادہر ہم نے لکھنے کے خیال سے کرسی سیدھی کی اور ادہر بیگم صاحب نے سروتا اور
چھالیا، یا کروشیا کی سوئیاں یا سوزن کاری کا چوکھٹا۔ یا لال براورز، کا ناول یا اخبار
صحیفہ جو کچھ ہاتھ میں تھا زور سے پٹک دیا اور گھورنے لگیں، ہم نے انگڑائی لیکر
سگرٹ جلایا اور فلس کیپ کا تختہ کھینچا کہ وہ اُٹھ کھڑی ہوئیں، ادہر ہم نے
فونٹن پن اٹھایا اور ادھر وہ آگے بڑھنے لگیں ابھی ہم نے کاغذ پر ایک نقطہ
بھی نہیں دیا تھا کہ انھوں نے "خطبۂ افتتاحیہ" یا "استقبالیہ" شروع فرمادیا،
جسمیں ہمارے دوست احباب رسائل اور اخبارات اس کے مدیر اور ناشر مرحوم
والدین اور خسر صاحب قبلہ اور "ننھے" میاں طولعمرہٗ سب کے نام لیے بعد دیگرے
نہایت ہی سنجیدگی سے گنائے گئے اور وہ صلواتیں سنائی گئیں کہ ہم نے آنکھیں

بند کرلیں، قلم میز پر رکھ دیا، سگرٹ کو تھالی میں پھینکا اور پھر کرسی پر دراز ہو کر "شادی اور اُس کے مضر اثرات" پر ایک پُر مغز مقالہ ذہن میں ترتیب دینے لگے،

رات مولوی عبدالوہاب نے مرغ کی دعوت دی تھی۔ کھانے کے معاملہ میں ہم بڑے فیاض واقع ہوئے ہیں، تیار ہو گئے مگر بیگم صاحبہ سے اجازت لینی بھول گئے۔ پانچ بجے مکتبہ پہونچے تو یاد آیا مگر کرتے کیا؟ مجبوری تھی کھانا کھا کر آٹھ بجے ریسی ڈنسی پہونچے قلعہ وار کو ایک تصویر ارسال کرنے دی تھی خیال تھا کہ تصویر لیتے ہوئے گھر جائیں گے مگر دوکان بند تھی، مجبوراً آگے بڑھا پڑا نامڈو کے پکچر پیلیس پر پہنچے تو نئی نئی تصویریں نظر آئیں اور ہم نے تعجب، حیرت، استعجاب سے دیکھنا شروع کیا اور رنگین پوسٹ کارڈ دیکھتے دیکھتے "کشمیر کی خوبصورتی" پر نظر پڑی تو طبیعت نکل گئی اسلئے نہیں کہ "حسنِ کشمیر" نے لبھالیا بلکہ "چند" گذری ہوئی راتیں یاد آگئیں، ہائے عقل پر نہ جانے کیا پردے پڑ گئے تھے کہ ہم نے کچھ سوچا نہ سوچنے کی کوشش کی اور نہ اسوقت سوچ ہی سکتے تھے، سائیکل سنبھالی اور کہیں سے کہیں پہنچ گئے مدتوں کے بعد ملاقات ہوئی تھی کچھ "شکوے شکایتیں" ہوئیں، کچھ "رونا دھونا" ہوا، کچھ "باتیں وباتیں" ہوئیں اب جو ہم گھڑی دیکھتے ہیں ساڑھے بارہ! اُف ہم تو سٹی بھول گئے مگر وہ بیچاری سمجھ دار تھیں کہنے لگیں "ہاں صاحب! بیگم صاحبہ انتظار کر رہی ہونگی جتنے جلد جائے ایسی جلدی تھی تو آنا کیا ضرور تھا، برسوں کے بعد آئے بھی تو منٹوں کیلئے دیکھئے! کہیں

بیگم خفا نہ ہو جائیں۔ خدا حافظ تشریف لے جائیے" ہم لاکھ "زن مرید" سہی مگر ایک صنفِ نازک کے ایسے چلے کٹے فقرے کس طرح سنتے، جھٹ شیروانی اتار دی شوز اور پاتابے بھی نکال دیئے جیب سے دستی نکال کر گلے میں باندھ لی عینک بھی اتار کر رکھدی اور سگرٹ کیس لیکر دھم سے چارپائی پر آرہے، اس مجنونانہ حرکت سے اس نیک بخت کو خوشی ہوئی یا رنج پہنچا اسکا علم خداوند عالم ہی کو ہو تو ہو مگر ہم تو اپنی دانست میں زن مریدی کی تہمت سے بری ہو گئے رات گذری اور بے غل و غش گذری بقول حضرتِ جوش۔

صد عمر گراں مایہ سے بہتر ہے وہ رات جو پہلوئے جاناں میں بسر ہوتی ہے

صبح ساڑھے چھ بجے چلے اور سوچتے چلے کہ کیا کریں آخر ایک ترکیب سوجھی ہم خوش خوش گھر پہنچے، پھاٹک پر رستم علی کو ڈانٹ بتائی دیوان خانہ میں لاؤ کو گالیاں دیں، سائکل کو زور سے پٹک دیا اور زنانے میں داخل ہوئے بنجا اور راستہ کترا کر جانے لگی تو اُسے بھی جھاڑ دیا اپنے کمرے میں پہنچکر دھماکے کیساتھ دروازہ کھولا دریچوں کو بھی زور سے کھینچ دیا۔ ٹوپی آرام کرسی پر پھینکی اور شیروانی تو اسٹانڈ پر ڈالدی، کالر کتابوں کی الماری پر پھینکا، پاتابے ردی کی ٹوکری میں ڈالے عینک گھڑیال کے اوپر رکھی، ڈراز کو زور سے کھولکر سگرٹ کا ڈبہ نکالا، اور منہ ہی منہ میں چند بے معنی الفاظ کہتے ہوئے غسل خانہ کا رُخ کیا۔ وہاں بھی خوب شور مچایا،

ہماری مسکینیت ضرب المثل تھی، ہم گربہ مسکین مشہور تھے گھر بھر کو معلوم تھا کہ ہمیں غصہ آتا ہی ہنیں اور اگر کبھی کبھی آ بھی جائے تو بیگم صاحبہ کی معمولی سی ڈانٹ میں سب فو چکر، مگر آج ہمیں غصہ میں بھرا ہوا دیکھکر گھر کا گھر سناٹے میں آ گیا ایک دوسرے کا منہ تکنے لگا ماموں صاحب چبوترے تک آ کر دیوان خانے میں چلے گئے ہم نے اہنیں سلام بھی ہنیں کیا، ممانی صاحبہ کمرے کے سامنے اپنی منجھلی صاحبزادی کے کمرے میں آ کر بیٹھ گئیں اور لگیں چلمن سے جھانک جھانک کر دیکھنے، ہماری منجھلی اور چھوٹی سالیاں بیگم صاحبہ کے پاس پہنچ گئیں اور کانا پھوسی ہونے لگی، ہم نے کہا چلو ابتدا تو اچھی ہوئی خدا کرے انتہا بھی اچھی ہو،

ساڑھے ساتھ بج گئے مگر ناشتے کا پتہ ندارد ہم نے کمرے کے دروازے پر کھڑے ہو کر نام بنام، بختاور، گلنار، لیلی، ہار سنگار، اناجی آیا، سب ہی کو ڈانٹ بتائی، آجتک ہم نے سوائے بختاور کے کسی کو کچھ ہنیں کہا تھا یہ جو سب کے نام لیکر ہم نے اپیچ دی تو بس سب کے سب دوڑ پڑے، کسی نے دسترخوان بچھا دیا کسی نے رکابیاں جما دی، کوئی کھانے کے برتن لانے گئی، کوئی دوڑ کر سیلاچی اور آفتابہ لے آئی، اناجی ہانپتے ہوئے آ کر کھچڑی کا ڈش رکھ گئیں، گلنار نے پاپڑ کی رکابی رکھی، اور لیلی نے اچار دان جما دیا، ہارسنگار مکھن لے آئی، آیا قیمہ کا کٹورہ لیکر دوڑی، ہم نے ناشتہ شروع کیا "ننھے میاں" کچھ رینگتے ہوئے آ گئے۔ ہم نے بکمال شفقت پدری انہیں بازو بٹھا لیا، اور ایک رکابی میں پاپڑ ڈال کر

سامنے رکھدیا وہ "ابا اماں روٹی، کھا ہوا پاپڑ کھانے لگا۔ ہم نے ناشتہ ختم کیا،
چائے کی دو پیالیاں پیں اور باہر نکلنے کے قصد سے پاتابے اور شوز پہنے مگر صحن
کو دیکھتے ہیں تو بھیگا ہوا، یوں تو کل چار بجے ہی سے بارش ہو رہی تھی اور صبح ہی
سے تقاطر ہو رہا مگر اب تو اچھی خاصی پھوار تھی، ہم نے کہا جانے بھی دو، دوپہر کا کھانا
کھا کر اطمینان سے چلینگے، بختاور نے کمرہ جھاڑ کر ٹھیک کر دیا تھا، ہم میز کے آگے
گھومنے والی کرسی پر بیٹھ گئے اور لگے نیرنگ کیلئے مضمون لکھنے! حضرت عزیز نے
مضمون کی فرمائش کی بھیجا تو لکھا کہ ایسا نہیں ایسا چاہئیے، اب کہئیے کیا لکھیں؟
ہم نے بہتیرا سوچا مگر کوئی عنوان سمجھ میں نہیں آیا،

"وہ لائٹ ہیومر" چاہتے ہیں اور یہاں یہ حال کہ "دل ہی بجھ گیا" خوش مذاقی
سوجھے تو کیسے اس کے لئے ضرورت ہے اطمینان، فارغ البالی، آسایش کی،
خدا سلامت رکھے وہ بھیّا رموزی ہی ہیں کہ چاہے دو وقت کھانا نہ ملے مگر آپ
"ظریفانہ" مضمون لکھے جاتے ہیں، ہم سے یہ نہیں ہوتا، خیر ہم نے کہا لاؤ کل کی
دعوت کی تفصیل ہی لکھ دیں مگر اس میں کیا تھا بدمزہ سالن اور عبدالحق صاحب
کے روکھے قہقہے! پھر خیال ہوا کہ گذشتہ رات ہی کے کچھ حالات لکھدیں مگر وہ بھی
اس قابل نہ تھے، چند شکوے شکایتیں، کچھ جلے کٹے فقرے، آئندہ کیلئے وعدے
اور قسمیں صبح کی وحشت انگیز واپسی! آخر سوجھی تو یہ کہ تفصیل ہی لکھدیں، ہم نے
دعوت کے بعد سے ترتیب وار واقعات کو قلمبند کرنا شروع کیا اور فلسکیپ کے

ڈیڑھ صفحے تک بھی نہ پہنچے تھے کہ کچھ "چلت پھرت" کے آثار معلوم ہونے لگے کمرے کے دروازہ کے پاس بڑی بیگم صاحبہ (ممانی اور خوشدامن) دیوار کی اوٹ میں کھڑی ہوئی نظر آئیں، دونوں دریچوں کے پاس دونوں سالیاں چھپی ہوئی دیکھنے لگیں سامنے مدن مست کے درخت کی اوٹ میں گلنار اور لیلی کھڑی تھیں، غسل خانہ کے پردے کے پاس آیا، انا جی اور بختاور کے سائے نظر آنے لگے ہم اس "نسوانی دھاوے" کا مطلب سمجھنے بھی نہیں پائے تھے کہ دبے پاؤں بیگم صاحبہ کمرے میں داخل ہوئیں، شہابی رنگت رونے سے سرخ ہو گئی تھی، آنکھیں اُبل آئی تھیں، گال تمتمائے ہوئے تھے، چہرہ پر "آرائش" نہ کرنے اور کسی قدر شب بیداری اور کرب و اضطرار کی وجہ سے اُداسی برس رہی تھی، نہ تو لباس ہی بدلا گیا اور نہ منہ دھویا گیا تھا مگر با وجود اس کے ایک "خاص ادا" تھی جو مارے ڈالتی تھی، کچھ غصہ، کچھ خوف، کچھ نفرت، کچھ رحم، کے مختلف اثرات چہرے سے نمایاں تھے مگر پیشانی پر ہزاروں شکنیں، تیوری چڑھی ہوئی، ناک کے نتھنے پھولے ہوئے، ہونٹ آپس میں ملے ہوئے تھے، ہم نے "جل تو جلال تو" کا ورد شروع کیا اور لگے براشتہ قلم لکھنے "وہ" آکر پیچھے کھڑی ہو گئیں ہم نے کاغذ پر بلاٹنگ پیپر رکھ دیا اور قلم کو ہونٹوں میں پکڑ کر غصہ سے دیکھنا شروع کیا، اُف! برس پڑیں اور بُری طرح برسیں!

"کہئے رات کہاں رہے؟ نہ جانے کس بیسوا کے یہاں رات گذاری صبح آئے بھی تو اس شان سے کہ سارا گھر سر پر اٹھا لیا، اب حکومت شروع ہو گئی وہ

بھیگی بلی جو کل تک چوہوں سے ناک کترواتی تھی آج حملہ کرنے دوڑتی ہے خدا کی شان، ننھے کو رات بھر بخار رہا، کھانسی کی وہ شدت تھی کہ غریب ساری رات نہیں سویا، مگر تمہیں کیا، تم کسی جگہ مزے اڑا رہے ہونگے، مہینہ میں دس بارہ راتیں ہی ایسی منحوس آتی ہونگی جو تم مکان پر سوتے ہو، ورنہ کبھی عبدالحق کے پاس دعوت ہوتی ہے تو کبھی عبدالوہاب کے پاس مہمانداری، کبھی عبدالرحمن سینما لیجاتے ہیں تو کبھی خانصاحب روک لیتے ہیں، کبھی رشید کولمبو سے آتے ہیں تو کبھی ارشید یادگیر کو جاتے ہیں، کبھی حمایت ساگر میں جلسہ ہوتا ہے تو کبھی گنڈی پیٹھ میں پارٹی ہوتی ہے، کبھی شمس آباد جاتے ہیں تو کبھی بھونگیر ہو آتے ہیں، یہ سب حیلے بہانے صرف رات بھر غائب ہونے کیلئے ہوتے ہیں، اور بس، ایسا ہی ہو تو صاف صاف کیوں نہیں کہدیتے کہ ہم آج رات گھر پر نہ سوئینگے، چلو چھٹی ہوئی، یہ جھوٹے واقعات بیان کرنے جھوٹ کہکر ایمان خراب کرنے سے فائدہ کیا؟

صبح ناشتہ کرکے غائب ہوئے تو ڈیڑھ دو بجے تک ندارد اور پھر آئے تو سوائے کھانا کھانے اور کپڑے بدل کر بھاگنے کے اور کوئی کام نہیں، کبھی افضل صاحب سے ملنا رہتا ہے تو کبھی مجید سے، کبھی قلعدار کے پاس کام رہتا ہی ہے تو کبھی تصدق حسین سے، کبھی مکتبہ جانا ہوتا ہے تو کبھی کتب خانہ ڈھائی تین بجے گئے تو پھر واپسی کی امید نہیں، وہ رات بڑی ہی خوش نصیب ہوتی ہے جو آپ کو آٹھ بجے گھر پہنچادے ورنہ آپ تو دس گیارہ بجے آئینگے یا صبح کو، رات آئے بھی تو

کپڑے اتارے اور لگے ڈاک دیکھنے، پھر جو خطوط اور مضامین لکھنے بیٹھ گئے تو دو دو بجے رات تک اور بعض وقت تو صبح تک اس مضمون نگاری کو خدا غارت کرے کہ اُس نے تم کو دین کا رکھا اور نہ دنیا کا، تمام وقت مضمون نگاری کی نذر سب کام اُس کے پیچھے خراب جورُو کی فکر نہ بچوں کا خیال، پانچ وقت کی نماز تو رہی دور آپ سے جمعہ بھی نہیں پڑھا جاتا، ساری دنیا جمعہ کی نماز کو جاتی ہے اور آپ بیٹھے مضمون لکھا کرتے ہیں۔ عیدیں گذر جاتی ہیں اتنا احسان تو کرتے ہیں کہ عید کی صبح اٹھکر نہا دھو لیا، اور پھر بیٹھ گئے لکھنے، جب سب لوگ نماز پڑھ کر عید گاہ سے آگئے تو آپ لوگوں سے ملنے چلے، رمضان میں ایک بھی روزہ رکھا ہو تو روزی نہ ملے، شعبان میں قبرستان پر فاتحہ پڑھی ہو تو دشمنوں کو وہی زمین نصیب ہو، شب برات قدر، معراج میں نماز پڑھی ہو تو گنہگار، کبھی کسی چیز پر ہاتھ اُٹھا کر فاتحہ دیدی ہو تو دشمنوں کے ہاتھ ٹوٹیں، کبھی کسی کے وعظ میں گئے ہوں تو قسم لیجئے اور پھر آپ کے مذہبی جوش کا یہ حال کہ امان اللہ خاں کو افغانیوں نے تخت سے اتار دیا تو ایکدن کھانا نہیں کھایا، ہائے افغانستان اجڑ گیا، ایک اسلامی سلطنت برباد ہو رہی ہے ایک اسلامی ملک متمدن بنتے بنتے جہالت کے گڑھے میں گر رہا ہے، لمبی لمبی ٹھنڈی سانسیں بھرتے رہے، نادر خاں کی تخت نشینی کی اطلاع سے اتنے خوش ہوئے کہ میں نے جلوے کی رات بھی اتنی خوشی محسوس نہیں کی تھی افغانستان بھاڑ میں جائے اور کابل کے تخت کو آگ لگے تم کون؟ تمہیں کیا کام؟ تمکو اس سے

غرض کیا؟

بچہ بیمار ہے تو تمہیں فکر نہیں، میں مرا کروں تو تمہیں پروا نہیں، گھر میں چاہے کچھ ہو جائے تمہیں احساس نہیں، تمہیں فکر رہتی ہے تو افغانستان کی، ترکی کی، ایران کی، البانیہ کی، امان اللہ خاں ثریا خانم، مصطفےٰ کمال، عصمت پاشا، رضا شاہ، احمد زوغو کی، آخر یہ لوگ تمہارے ہیں کون؟ خیر یہ ہی غنیمت ہے کہ ممالک اسلامیہ اور اسکے فرمارواؤں سے تمہیں ہمدردی تو ہے مگر یہ مضمون نگاری آخر کیوں؟ معارف، نگار، ہمایوں، نیرنگ خیال، مرقع، نیرنگ، تجلی، شاعر، فردوس، اولڈ بائے، ان رسالوں سے تمہیں کیا کام تم ندوۃ العلماء کے طالب علم نہیں، کسی مسجد کے مولوی یا خانقاہ کے پیرزادے نہیں پھر معارف سے دلچسپی کیوں، کوئی دہریئے لامذہب پانچ کی بجائے دو نمازوں کے قائل نہیں، نیاز فتحپوری کے متبع نہیں پھر نگار سے ہمدردی کس لئے؟ لاہور سے کوئی تعلق نہیں، پنجاب میں پرورش نہیں پائی پھر ہمایوں، نیرنگ خیال، فردوس کا کلمہ پڑھنا کیا ضرور، لکھنو کی شاعری سے تمہیں نفرت، لکھنوی طرز معاشرت سے چڑھ، پھر مرقع سے لگاؤ کس لئے؟ رامپور تم نے دیکھا نہیں، پھر وہاں کے نیرنگ میں مضمون نگاری کیا معنی؟ امروہہ سے تمہیں کونسا تعلق، نام ہی نام تو سنا ہے پھر وہاں کے رسالہ شاعر کی فکر کس واسطے؟ حیدر آباد سے سینکڑوں رسالے نکل رہے ہیں بیسیوں اخبار جاری ہیں مگر تمہیں تجلی سے خصوصیت کیوں؟ سردار علی صاحب تمہارے اُستاد ہوں تو یہ کیا ضرور ہے کہ

سب رسالوں کو چھوڑ چھاڑ کر تم تجلّی ہی کے ہو رہو؟ آخر ان رسالوں کیلئے اپنی اوقات کب تک برباد کروگے؟ نیرنگ خیال کا سالنامہ نکلے تو تمہیں فکر عید نمبر نکلنے والا ہو تو تمہیں خیال، نیرنگ کا خاص نمبر نکلے تو تم ہمہ تن متوجہ بھلا تم کون ساری جہاں کا درد تمہارے جگر میں کیوں؟ دس سال سے اپنی اوقات انہیں پرچوں کے پیچھے خراب کر رہے ہو، آخر کوئی فائدہ ہوا ہو تو بتاؤ اسوا اسکے کہ اور غلط فہمیاں بڑھ گئیں کچھ دنوں تو تو میں میں ہوتی رہی اس کلموہے محتسب نے احتساب لکھ مارا، تم نے اس کا حلیہ لکھدیا، یوں چلتی رہی مضمون نگاری کیلئے روپیہ برباد، اوقات خراب، کام خراب اور پھر فائدہ ندارد، اورنگ آباد کے ایک نہیں دو چکر کاٹ کے کیا تو کیا کیا کہ ایک مضمون "اورنگ آباد اور اسکے نواح" کے عنوان سے لکھ مارا اور پندرہ روز اور روپیہ پیسہ خراب کرکے دولت آباد، خلد آباد، ایلورا کی خاک چھانی اور ہاتھ کیا آئے تو دو مضمون جن میں ایک مضمون پر اس لمبوترے کلموہے نے احتساب بھی لکھ دیا، گلبرگہ کے قلعہ اور گنبد کی اینٹ سے اینٹ بجادی، آٹھ سال وہاں رہکر ایک ایک چیز دیکھتے رہے، تاریخ بھی لکھی مگر وہ تو چھپوانی نصیب نہ ہوئی البتہ ایک مضمون لکھ مارا چلو بڑا کام کیا۔ رنگین، انشا، قیس اجان صاحب کی ریختیوں کو سکندر نامہ کی طرح پڑھ پڑھ کر بازاری محاوروں کو سمجھنے کی خاطر ہندوستانی طوائفوں سے اختلاط پیدا کرکے دو تین مضمون ریختیوں پر لکھے تو کیا ہوا، کونسا خان بہادری کا خطاب

اور پنج ہزاری منصب مع پالکی جھالردار ملا؟ ادبیات اور تاریخ میں اس قدر سر کھپا کر اتنے مضمون لکھکر کیا فائدہ ہوا، افسانے لکھ لکھکر کونسے خطاب پائے؟ کسی چیز سے بھی کوئی فائدہ ہوا ہو تو بتاؤ سوا نقصان کے اور کچھ نہیں، لوگ مجھ سے کہتے ہیں کہ "بیگم! تمہارے شوہر خدا رکھے حسین خوشرو، پڑھے لکھے، مضمون نگار، لائق اور مشہور اور نیک ہیں خدا ہر ایک لڑکی کو ایسا شوہر نصیب کرے" میں یہ سنتی ہوں اور خون کے گھونٹ پی کر رہ جاتی ہوں، خوش رو اور حسین شوہر کو لیکر کیا کروں جبکہ وہ مجھ سے دن بھر میں دو چار وقت بھی بات نہ کرتا ہو، پڑھے لکھے مضمون نگار اور لائق شوہر سے کیا فائدہ جبکہ مضمون نگاری سے اُسے فرصت ہی نہ ملتی ہو اور وہ میری طرف متوجہ ہی نہ ہوتا ہو۔ ایسی شہرت کو آگ لگے۔ جسکی خاطر انسان بیوی کو بھی بھول جائے، ایسی نیکی بھاڑ میں جائے جو سب کے لئے نیکی ہو اور گھر کی بیوی کیلئے بدی سے بدتر، کاش تم پڑھے لکھے نہ ہوتے مضمون نگار نہ ہوتے، مشہور نہ ہوتے، بالکل جاہل، لکھنے پڑھنے کے ناقابل نہایت ہی گمنام بہت ہی بدصورت، بڑے ہی بدمزاج ہوتے مگر مجھ سے سیدھی طرح رہتے جب تک گھر پر رہتے مجھ سے مخاطب رہتے واللہ مجھے دنیا ملجاتی دنیا!"

ہم نے لاکھ لاکھ ضبط کیا مگر طبیعت نکل ہی گئی خصوصاً آخری جملے پر آگ سی لگ گئی، ہم نے ڈانٹ کر کہا،

"ہم خوشرو ہوں، لکھے پڑھے ہوں، مشہور ہوں، نیک ہوں اور تمہارے لئے

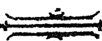
بد سے بدتر ہوں تو تم خوشی سے کسی جاہل، نا قابل، گمنام، بدصورت، بدمزاج رات دن تم سے باتیں کرنے والے کو ڈھونڈ لو تمہیں دنیا مل جائے گی، ہم یونہی لنڈورے بھلے"

ہم نے کہنے کو تو غصے سے کہہ دیا مگر "وہ" بے تحاشا دھاڑیں مار مار کر رونے لگیں، ہماری کرسی کے دستے پر سر رکھ دیا۔ آنسوؤں کے موٹے موٹے قطرے کرسی کے دستے پر گر کر گدے پر گرنے لگے ہم چاہتے تھے کہ اسی حالت میں "انہیں" چھوڑ کر باہر چلدیں مگر قدم نہیں اٹھتا تھا لاکھ لاکھ چاہا کہ خاموش ہی بیٹھے رہیں مگر یہ بھی نہ ہو سکا، رچرڈ ہنری سیوج نے سچ کہا ہے کہ "لوہا ہے کو بیشک نرم کر سکتا ہے مگر مرد کا جوش عورت کے غصے کو ہرگز فرو نہیں کر سکتا" اور عورت کے معاملہ میں ایسا کون آدمی ہوگا جو قاعدے اور اصول کا پابند رہ سکا ہو، ہم اٹھ کھڑے ہوئے "انہیں" اٹھا کر چھاتی سے لگا لیا، دلاسا دیا، تشفی دی، کچھ سمجھایا، ذرا گدگدایا، انتہا یہ کہ "تھوڑا میکے میں جی گھبراوت ہے" گا کر ہنسا ہی دیا، ہنری مارٹین نے کس قدر ٹھیک کہا ہے کہ "مرد بالخصوص اس زمانے میں جبکہ اسکی بی بی کا عنفوان شباب ہوتا ہے اور اولاد بہت صغیر سن ہوتی ہے بہ نسبت "بہترین باپ" ہونیکے وہ بہترین شوہر قدرتی طور پر ثابت ہوتا،" مجیر حلیت بہت معلوم ہونے لگی، خوشدامن صاحبہ اپنے دالان کی طرف مسکراتی ہوئی تشریف لے گئیں دونوں سالیاں کڑھتی ہوئی اپنے اپنے کمروں میں چلی گئیں، چھوکریاں اور انا جی، آیا بھی رفوچکر ہو گئیں

ہم نے "انکا" منہ دھلوایا گلنار ناشتہ لائی پھر ہم دونوں نے ملکر ناشتہ کیا "ننھا" بھی آگیا اور وہی ابا اماں روٹی کہکر پاپڑ کھانے لگا، چائے پیتے ہوئے ہم نے ہنس کر کہا "منّے! اجازت دو تو ذرا مضمون ختم کرلیں نیرنگ کو بھیجنا ہے" تو ہنسکر کہنے لگیں "ابھی تم کو اتنا کہا مگر کچھ اثر نہ ہوا، اچھا لکھ لو میں نہا کر کپڑے بدل لیتی ہوں"

ادہر وہ نہانے گئیں اور ادہر ہم نے مضمون لکھ لکھا کر ختم کر لیا۔

یہ ہے ایک گھریلو زندگی کا نقشہ، یہ ہے ہم مضمون نگاروں کی زندگی، یہ ہے ہم پڑھے لکھوں کی خرابی، یوں مضامین لکھتے ہیں اس طرح رات بھر غائب رہتے ہیں۔ یوں اثر ڈالنے کی فکر کرتے ہیں، اور پھر ایسے وبجاتے ہیں، کہئے پھر مضمون لکھا جائے تو کیونکر اور خوش مذاقی سوجھے تو کس طرح ہم نے جان پر کھیل کر سارا قصہ لکھ تو دیا مگر خدا نہ کرے کہ یہ مضمون طبع ہو کر "بیگم صاحبہ" کی نظر سے گذرے ورنہ قیامت ہی آئے گی۔



ہم اور ہماری عید

عید کی خوشی ہر اس شخص کو ہو سکتی ہے جو حقیقی معنوں میں روزہ دار ہو مگر ہمارے نزدیک عید کو روزوں سے اسی قدر تعلق ہوتا ہے جس قدر کہ ہمارے سیاسی لیڈروں کو حقیقت و صداقت خلوص اور ہمدردی سے یعنی ان میں سے کوئی چیز بھی ان کے پاس نہیں مگر وہ ہیں لیڈر اسی طرح ہم نے ایک روزہ بھی نہیں رکھا مگر عید منانے تیار ہو گئے

۲ مارچ سنہ ۱۹۳۰ء کو ۹½ بجے رات کو ہم مکان پہنچے تو عجب چہل پہل تھی۔ بچوں کی چیخ پکار بڑوں کی ہنسی، بوڑھوں کی دوڑ سب ملکر ایک عجیب منظر پیش کر رہی تھیں۔ ہم نے کھانا کھا کر سونے کا ارادہ کیا ہی تھا کہ ہماری چھوٹی سالی صاحبہ آدھمکیں اور مجبور کر کے بائیں ہاتھ کی چھنگلیا کو مہندی لگا گئیں، بارہ بجے رات تک مذاق دل لگی کر کے کہتی گئیں کہ اس عید کے تحفے میں ایک کروشیا کا سٹ لونگی۔ ہماری بیگم صاحبہ اپنی والدہ کے پاس تھیں [illegible] نے کیا کیا

ہو رہے تھے ہم نے ابھی خوابگاہ کا رُخ نہیں کیا تھا کرسی سے اٹھ کر انگڑائی ہی لے رہے تھے کہ "وہ" آگئیں، کہنے لگیں "کہو تو سہی ہم کل کیا پہنیں"۔ ہم نے کہا خدا کیلئے کچھ نہ پہنو ایک عید یونہی بغیر پہنے اوڑھے سہی۔ کہنے لگیں ہیں تم کو تو مذاق سوجھ رہا ہے"۔ ہماری شادی کے بعد سے کپڑے لتوں پر ہمیشہ لڑائی ہونے لگی اسکی وجہ یہ تھی کہ بعض رنگ جو ہماری بیگم صاحبہ کو پسند تھے ہمیں پسند نہ تھے اور بعض جو ہمیں پسند تھے انہیں ناپسند تھے، آخر میں یہ تصفیہ ہوا کہ ہم ان کے پسند کردہ کپڑے پہنا کریں اور وہ ہماری خواہش کے موافق لباس پہنیں۔ اسمیں شک نہیں کہ اس سے چند روز تک دونوں کو سخت کوفت ہوئی مگر رفتہ رفتہ عادت ہوگئی اب ہمیں وہ جو پہناتی ہیں ہم پہن لیتے ہیں اور ہم انہیں جو پہناتے ہیں وہ پہن لیتی ہیں۔ بعض خاص خاص موقعوں پر ایک دوسرے سے اجازت لیکر من مانے رنگ کے کپڑے بھی پہن لیتے ہیں۔ مگر ایسا اتفاق سال میں دو ہی تین بار ہوتا ہے۔ خیر

"انہوں" نے ہمارے لئے پیں، او، کا ایک پاجامہ، اودی دھاری دار سفید ریشمی شیروانی، زفر کی سُرخ قمیص، باریک جالی دار نیم آستین نکالکر باہر رکھ دیا، دستی پائتابے اور جوتے ٹوپی کا انتخاب بکمال سرفرازی ہمیں پر چھوڑ دیا گیا، ہم نے "اُن" کے لئے نافرمانی رنگ کی ریشمی ساڑھی اور ہلکے آسمانی رنگ کا کرتا پسند کیا اور بقیہ کپڑوں کا انتخاب انہیں پر چھوڑ دیا، اس "کپڑوں کے انتخاب"

میں تین بج گئے، ہم نے چار بجے خوابگاہ کی صورت دیکھی، ٹھیک ساڑھے پانچ بجے بجتا ورنے دروازہ ٹھونک ٹھونک کر جگا دیا، ہم نے آواز سنی اور کروٹ بدل لی البتہ "وہ" اٹھ بیٹھیں انگڑائیاں لیں، لباس درست کیا اور پلنگ سے اتر کر کھڑی ہوگئیں لحاف کھینچ کر پھینک دیا اور لگیں ہمارے گال پر ستار کی مشق کرنے یعنی انگلی سے آہستہ آہستہ مارنے۔ ہم نے جب بھی آنکھیں نہیں کھولیں تو ناک کے دونو نتھنے پکڑ کر بند کر دیئے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہمارا سانس رک گیا اور ہم نے بکمال اضطراب آنکھیں کھولدیں اور ہنسی خوشی اٹھ بیٹھے۔ ضروریات سے فارغ ہوئے غسل کیا۔ لباس تبدیل کیا اور کمرے میں آکر بیٹھ رہے۔ ننھے میاں طوطرہ بھی انّا کی گود سے اتر کر سیوں اور دیوار کا سہارا لیتے ہوئے آپہنچے اور لگے ہمارے گھٹنوں کے سہارے کھڑے ہو کر اول جلول بکنے اسی اثنا میں ناشتہ آگیا اور وہ بھی آگئیں اب ماں بچے کو گود میں لئے بیٹھی ہے باپ ناشتہ کر رہا ہے بچہ ہاتھ بڑھا کر کچھ مانگتا ہے تو باپ ایک آدھ نوالا منہ میں ٹھونس دیتا ہے مامتا کی ماری ماں مسکراتی ہے اور ...."

ناشتہ ختم کر کے ہم نے ٹھیک ½ ۶ بجے قمیص پر عطر ملا دستی کے کونوں پر بھی لونڈر چھڑکا اور بن سنور کر چلے گھر سے پڑھنے کو نماز عید کی مگر چار مینار تک آکر خیال آیا کہ اگر عیدگاہ جائیں تو راستہ میں بھیڑ بھاڑ زیادہ رہے گی واپسی میں بھی زحمت ہوگی، بہتر یہ ہے کہ کسی اور مسجد میں نماز پڑھ لیں پھر یاد آیا کہ ۔

محلے کی مسجد میں نماز پڑھ لیں۔ پھر یہ بھی خیال ہوا کہ اب کہاں کی نماز کہد ینگے کہ
عیدگاہ میں نماز پڑھ لی اب چلو لگے ہاتوں چند لوگوں سے مل لیں، بس اس
آخری فیصلہ پر عمل کرنے کیلئے ہم نے سائکل موڑی اور سیدھے قطبی گوڑہ جا پہنچے
وہاں سے مل ملا کر نکلے تو دس بج چکے تھے راستہ میں جس قدر ملاقاتیوں اور
دوست احباب کے مکان ملے ہم نے سبھوں سے ملاقاتیں کیں آخر میں
عبدالحق کے پاس پہنچے عید کا روز تھا عبدالحق صاحب نے مکتبۂ ابراہیمیہ کو
تعطیل دے رکھی تھی۔ وہاب بھیں موجود تھے بہر حال دوپہر کا کھانا وہیں تناول
ہوا مغرب تک گپ ہوتی رہی مغرب کو چائے پی کر سینما پہنچے ½۸ بجے رات تک
سینما دیکھا اور تھیٹر سے نکل کر وہاب اور عبدالحق کو خدا حافظ کہتے ہوئے گھر کی
طرف چلے ابھی ہم افضل گنج کے پاس ہی پہنچے تھے کہ میاں غضنفر علی نے روک لیا
اور نہ صرف روکا بلکہ زبردستی ساتھ لیکر گھر کا رخ کیا ہمارا خیال تھا کہ مکان پر
دس پندرہ منٹ ٹھہر کر واپس ہوجائیں گے مگر وہاں پہنچے ہیں تو "علی غول"
موجود "یارانِ نجد" کا مجمع، رات کا کھانا بھی وہیں ہوا اور پھر گانا شروع ہوا۔
"چمپا" واقعی اچھا گاتی ہے "جب تم چلو زمین چلے آسماں چلے" والی غزل
اس نفاست سے بتا کر گائی کہ واہ معلوم ہوتا تھا کہ واقعی زمین و آسمان دونوں
چل رہے ہیں۔ حضرت جلیل یقیناً موسیقی کے ماہر ہیں جبھی تو ایسی غزل کہی جو
بتا کر گانے کیلئے ہر طرح موزوں ہے خیر ۱۱ بجے سے صبح کے ۴ بجے تک گانا

ہوتا رہا اس اثناء میں گھر جانے کا خیال ہی نہیں آیا، صبح گھر چلنے کی فکر کی تو
فدا حسین نے ناشتہ کرکے جانے پر مجبور کیا مجبوراً یہ بھی کرنا پڑا، نو بجے بدقت
تمام غضنفر علی کے گھر سے چلے، میر عالم کی منڈی کے پاس میاں رشید مل گئے۔
معہ احباب سمیت، گنڈی پیٹ کے تالاب کو جا رہے تھے ہمیں جو دیکھا تو موٹر
روک پکڑ ہی لیا کہ چلو، لاکھ لاکھ کہا کہ بھئی کل صبح کا گھر سے نکلا ہوا ہوں جانے بھی
دو، مگر کوں مانتا سیکل اُن کے حوالے کرکے موٹر میں بیٹھنا پڑا اور چلے طرف گنڈی
پیٹھ کے۔ راستہ میں یاروں نے ارادہ بدل کر حمایت ساگر چلنے کی ٹھان کی
جوں توں کرکے تالاب پر پہنچے، دوڑنے کی مشق ہوئی، تیرنے کی شرطیں ہوئیں،
گانے کا مقابلہ ہوا، تاش کھیلا گیا، بیت بازی ہوئی "صنم آمد" کا بھی شغل رہا،
کھانا کھایا چائے پی، مچھلیوں کا شکار ہوا، سات بجے شام کو ڈاک بنگلے میں
آکر بیٹھ رہے ہم یہ سمجھ رہے تھے کہ اب واپس ہونگے۔ پوچھا تو رشید نے بکمال متانت
جواب دیا کہ "ابھی چلتے ہیں" مگر ۸ بجے ایک موٹر آیا جس میں ایک "منواں" کی
(وہاں یہ لہجۂ خاص) بی صاحبہ تشریف فرما تھیں انکے سازندے اور سنگتی بھی
ورلی طرف ہی کے تھے وہ سیدھی ڈاک بنگلہ پر ٹھہر گئیں۔ ایک صاحب نے
بڑھ کر انہیں بلالیا اور اب وہ ہمارے سامنے گول میز کے پاس آرام کرسی پر
گھبرائی ہوئی سی بیٹھی تھیں۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ بی صاحبہ حیدری
روڈ پر سے آئی ہوئی ہیں رہنے والی یو پی کی ضرور ہیں مگر اپنے آپ کو خاص

لکھنؤ والی ظاہر کرتی ہیں اور میاں رشید کی بلائی ہوئی تشریف لائی ہیں بس ہمارا خون ہی خشک ہو گیا۔ خیال کیجئے، عید کی نماز کو گھر سے چلے تھے سارا دن گذر گیا رات گذر گئی دوسرا روز بھی آ گیا اب دوسری رات کی باری تھی گھر پر ہنگامہ ہو گا خدا ہی بہتر جانتا ہے، واللہ خیال ہی سے رونگٹے کھڑے ہو گئے حضرت ہم ٹھہرے "رسی ڈنٹ ممبر" یعنی گھر داماد، اب غور فرمائیے کہ ہم پر کیا کیا آفتیں نہ آتی ہونگی اور اسطرح غائب رہتے سے ہماری کیا گت بنے گی۔

ایک تجربہ کار، ستمہائے زوجہ و خوشدامن و خسر دیدہ، طمانچہ ہائے سالیاں چشیدہ "گھر داماد" کی حیثیت سے ہم تمام اپنے گھر داماد و خانہ داماد بھائیوں کو وصیت کرتے ہیں کہ بھائیو! اگر خیر چاہتے ہو تو ہر طرح جورو کے غلام بنے رہو، دوست احباب کو چھوڑ دو، گانے کے جلسوں کو سلام کر دو تھیٹر اور سینما دیکھنے کی قسم کھالو، دفتر سے گھر اور گھر سے دفتر تک جایا آیا کرو اور بس، جورو جو کھلائے کھاؤ، اور خسر اور خوشدامن جو پہنائیں پہنو، جو حکم ملے "جنرل آرڈر" سمجھ کر تعمیل کرو ورنہ یاد رکھو اتنی بے بھاؤ کی پڑیگی کہ چاند پر ایک بال نظر نہ آئے گا.......

....

ڈاک بنگلے کے بیچ کے بڑے ہال میں دسترخوان بچھا سب نے ملکر تناول! حضرت سے عند اللہ ماجور ہونے کی کوشش کی بلکہ بعض تو خوب مشکور ہوئے، اتفاق سے بی........جان ہمارے مقابل تشریف فرما تھیں، دوران

تکلف میں کبھی ہم نے سالن کا کٹورہ انکی طرف بڑھا دیا اور کبھی انہوں نے بریانی کا ڈش ہماری طرف ڈھکیل دیا کبھی ہم نے بگھارے بینگن انکی پلیٹ میں جھونک دیئے، انہوں نے کھیر کی پیالی ہماری رکابی میں الٹ دی بہرحال اس تکلف نے بے تکلفی کی صورت اختیار کی کھانے سے فارغ ہونیکے بعد صرف ایک ہم ہی ہم تھے جو اُن سے بڑی بے تکلفی کے ساتھ پیش آرہے تھے اُن کے پاندان کا پہلا پان ہمیں کو ملا اور وہ بھی اس شان سے کہ خود آں محترمہ نے اپنے دست نازک سے ہمارے ہونٹوں میں دے دیا جو بیگم صاحبہ کے خوف سے تھرا رہے تھے بلکہ قدرے زرد بھی تھے۔

واقعہ یہ ہے کہ ہم واقع ہوئے ہیں بہت ہی بے تکلف بلکہ بقول ..... کے "فاسٹ ورکر" ادھر آنکھ ملی اور ادھر ہم نے سلام کیا ادھر سلام کیا ادھر مصافحہ ہوا کہ وہ ہنسے اور ہنسنا ہی تھا کہ ہم نے کچھ کان میں کہا ادھر سے انہوں نے بگڑ کر صلواتیں سنائیں اور ہم نے مسکراتے ہوے کانا پھوسی کی تو بس کھل گئے، الٹے ہاتھ سے ایک "مہین سا" طمانچہ رسید کر دیا، چلو ہم گال سہلاتے ہوئے بازو بیٹھ گئے پھر کیا ہے۔

ہمیں ہم ہیں زمیں سے آسماں تک

مگر یہ سب باہر ہوتا ہے گھر پر کچھ پیش نہیں جاتی جو جائے

ہمیں جو رو کو اپنے دام میں لانا نہیں آتا بنانیوالے آئینہ بنا لیتے ہیں پتھر سے

بہرحال، المختصر بلکہ، فی الحقیقت یہ، امر واقعہ، یہ ہے کہ بی صاحبہ کی
آنکھیں غضب تھیں گو،

وحشت کرنا شیوہ ہے کچھ اچھی آنکھوں والوں کا

مگر آہوئے وحشی کم از کم مجھ مجنوں منش سے رام تھا، بس پھر کیا تھا، گھر
کی یاد یک قلم فراموش ہو گئی بس اتنا خیال ہے کہ گانا شروع ہوا

اتنا تو مجھے یاد ہے کہ کچھ گاتی تھی ....

کیا گاتی تھی .... مجھے کچھ یاد نہیں ہے

صبح گانا ختم ہوا تب کہیں مجھے ہوش آیا۔ انہوں نے کہا کہ چلو ذرا تالاب
ہمیں دکھا دو ہم نے کہا زہے نصیب ساتھ لے کر چلے صبح کا وقت، سرد سرد
ہوا چل رہی تھی رات بھر کی تھکن اور نیند کا خمار، ظالم کی مخمور آنکھوں کو اور
بے پناہ بنا رہا تھا، نہ جانے میں نے کیا کہا اور انہوں نے کیا جواب دیا کہ
میں نے ان مخمور آنکھوں کو چوم لیا، اگر چند لوگ ناشتے کیلئے نہ بلانے آتے
اور ہمیں اس طرح "منہمک" دیکھ کر شور و غوغا نہ کرتے تو نہ جانے کیا کچھ ہوتا، خیر
یہ گذری کہ ان حضرات نے ہمیں زبردستی ڈاک بنگلے میں پہنچا دیا، ناشتہ ہوا اور
خوب ہوا، رشید نے واپسی کی تحریک کی اور کہا کہ ۱۱ بجے واپس ہونا چاہیے۔
مگر یہاں کون مردود اس قدر جلد واپس ہونا چاہتا تھا، میں نے کہا کہ دو بجے
"قلعہ" جانا ہے میرے لئے "فون" کرکے ایک کار منگوا دو ڈیڑھ بجے ہیں قلعہ

جاؤں گا اور تم لوگ گھر چلے جاؤ رشید نے اسے منظور کرلیا اور چار ٹیکسی موٹروں کیلئے "فون" کیا گیا، بی صاحبہ نے اس "قلعہ" کو جانے کی علت کو میری امیدوں کے خلاف بہت جلد بھانپ لیا کہنے لگیں "اگر آپ مناسب سمجھیں تو میں بھی ساتھ چلوں مجھے بھی قلعہ دکھائیے" میں نے فوراً انکار کردیا کہ مجھے فلاں صاحب سے ملنا ہے فلاں کے گھر جانا ہے مگر رشید وغیرہ نے مجبور کیا کہ "اماں! لے بھی جاؤ تم باہر بیٹھ جانا پردے لگا کر انہیں اندر بٹھا دو، تم جن سے بھی ملو گے آخر موٹریں تو بلا کر نہیں ملو گے، جلدی مل لینا یہ موٹریں ٹھہری رہیں گی نہ جانے پھر اس طرف ان کا آنا ہو یا موقع نہ مل سکے یہ بھی قلعہ دیکھ لیں گی" مشہور ہے تیر بہ ہم نے بھی صفت کرم داشتن کے تحت منہ بنا کر رشید کے مشورے کو قبول کرلیا، ڈیڑھ بجے چلے، تھوڑی دور تک تو ہماری موٹریں ایک دوسری کے پیچھے پیچھے چلتی رہیں مگر پھر راستہ بدلنا پڑا ہم ایک طرف روانہ ہوئے اور رشید وغیرہ دوسری طرف قلعہ گئے کسی سے ملنا تھا ہی نہیں اور نہ ملنے کو جی چاہتا تھا وہ تو ایک بہانہ تھا اُن حضرات کو رخصت کرنے کا قلعہ دکھایا اور پھر اسی ڈاک بنگلے کو لوٹ آئے جس میں ایک رات اور آدھا دن بسر ہو چکا تھا رات کا کھانا ہم دونوں نے ملکر تناول کیا اور سو رہے صبح سویرے ناشتہ کیا تالاب کی سیر کی اور ۹ بجے وہاں سے نکلکر...... پہنچے چشم پر نم انہیں رخصت کیا دوسرے روز ملنے کا وعدہ کرکے چلے مگر مشکل یہ تھی کہ روپئے سب ختم

ہو چکے تھے ...... کے پاس جا کر روپے لئے ٹکسی کا کرایہ ادا کیا "کروشیا" کا
ایک سٹ چھوٹی سالی کیلئے لیا، بیگم صاحبہ کیلئے بھی دو تحفے لئے بچے کیلئے
کھلونا خریدا اور تانگے میں لدے ہوئے گھر پہنچے "چل تو جلال تو" کا ورد کرتے
ہوئے تانگے سے اُترے رستم علی نے آکر کھلونا وغیرہ آتارا ہم اندر پہنچے دیکھتے
کیا ہیں کہ ہمارے کمرے میں "قُل بیچ" ہے، خوشدامن صاحبہ سے لیکر مامائیں
اور چھوکریاں تک یہیں جمع ہیں ہمارا "ننھا" بیچوں بیچ آنکھیں بند کئے پڑا
ہوا ہے، سرہانے بیگم صاحبہ تشریف فرما ہیں، اس کے پائیں میں خوشدامن
صاحبہ بیٹھی ہیں دونوں بازوں پر ہماری دونوں سالیاں ہیں، چھوکریاں بھی
کھڑی ہوئی ہیں ہم نے کمرے میں داخل ہو کر خوشدامن صاحبہ کو سلام کیا اور
بس مگر بڑی بی نے خلاف معمول نہ تو بلائیں لیں اور نہ دعا ہی دی صرف
چھوکریوں اور ماماؤں نے ایک ایک بندگی کر کے فرار ہونا شروع کیا،
سالیوں نے دیکھا تک نہیں البتہ دوپٹے کے پلّو سر پر کھینچ کر سیدھی ہو بیٹھیں "وہ"
البتہ پہلو بدل کر رہ گئیں۔ دو موٹے موٹے آنسوؤں کے قطرے آنکھ سے نکلکر
رخساروں پر سے گرتے ہوئے تھوڑی کے پاس آکر "بہ اندازِ چکیدن سرنگوں"
ہوگئے ہم نے نہایت سراسیمگی سے آگے بڑھکر ننھے کی نبض دیکھی معمولی بخار تھا
تھرما میٹر لگا کر ٹمپریچر لیا تو صرف ایک سو ایک ڈگری بخار تھا کمرے کا یہ حال
تھا کہ ایک طرف انگیٹھی دہک رہی تھی دروازے بند اور ننھے کو دو موٹی موٹی

بلانکٹیں اٹھائی گئیں تھیں سب سے پہلے ہم نے انگیٹھی اٹھوادی، دروازے
اور کھڑکیاں کھول دیں۔ ننھے کے پاؤں سے دونو بلانکٹیں اتار کر پھینک دیں
اسٹانڈ پر سے تولیہ لیکر ٹھنڈے پانی سے بھگویا اور اس کے سر پر ڈال دیا، چار پانچ
منٹ کے بعد ننھے نے کروٹ لی اور پھر آنکھیں کھول کر نا تواں آواز میں پکارا
”ابا“۔ ہم نے گود میں اٹھایا۔ پہلے تو اس نے پریشانی سے گھورنا شروع کیا اور
پھر گلے سے لپٹ کر لگا رونے ہم نے سمجھایا کھلونے لانے کا تذکرہ کیا، بخاور کو
بھیج کر رستم علی کے پاس سے کھلونے منگوائے، ریل، کبوتر، بندوق، ڈھولنا
بانسری دیکھ کر ”ننھا“ گود سے اتر پڑا۔ اور لگا ہنسنے پھر ذرا بندوق چلانے کی کوشش
کی۔ کبوتر کو داب داب کر اس کی آواز سنی۔ اور ڈھول پیٹا، بانسری کو بھی دو ایک
بار پھونکا، کنجی دیکر ریل کو ادھر ادھر دوڑایا ننھے کو ٹھیک کھیلتے دیکھ کر بی بی
کے ہونٹوں پر تبسم کی لہر دوڑ گئی، اور وہ آہستہ سے اٹھ کر چلی گئیں بیگم صاحبہ منہ
ہی منہ میں بڑبڑاتی ہوئیں کرسی پر جا بیٹھیں۔ دونوں سالیاں بھی ایک ایک کر کے
کھسک گئیں، آپا البتہ ٹھہر گئیں ننھا جب ریل سے اکتا گیا تو بندوق لیکر آپا پر پل
پڑا مجھ سے کہنے لگا۔ ”ابا آپا کو ماروں“ میں نے کہا بیٹا وہ مرجائے گی“ کہنے لگا لے
ویسا نہیں ماروں گا“ میں نے کہا ”زندہ رہی ویسے مارو۔“ آپا نے آگے بڑھ کر بلائیں
لیں۔ اور بندوق سمیت گود میں اٹھا کر پیار کر لیا، ہم نے دودھ منگوا کر ننھے کو
پلایا اس کے بعد وہ اطمینان سے کھیلنے لگا۔ پھر جو تھرمامیٹر دیکھا تو نارمل تھا، بات

دراصل یہ ہوئی کہ دو دن نہیں تہ دیکھ کر اس نے رونا شروع کیا اور اسی رونے دھونے میں بخار آگیا، بجائے اسکے کہ اسے بہلا پھسلا کر رونے سے باز رکھا جاتا اور بخار کیلئے کوئی دوائی دی جاتی، عقلمندوں نے پلا دیا جلاب اور پھر کمرے کے دروازے بند کرکے انگیٹھی جلا کر دو دو بلانکٹ اڑھا کر اور ہوا بنا دیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بخار اور بڑھ گیا۔ اگر ہم وقت پر نہ پہنچتے تو معلوم نہیں ننھے میاں رہتے یا اسی کمسنی میں "نوجوان والدین کو داغ مفارقت" دے جاتے۔

ننھے میاں تک آیا ہے بڑی سمجھدار۔ جب ہمیں بے چین دیکھی تو ننھے میاں کو مع کھلونوں کے گود میں لے اسکی خالہ کے کمرے کی طرف چلے گئی ہم نے بکمال اطمینان بیگم صاحبہ کا غصہ اتارنا چاہا، گدگدایا، چھیڑا، چٹکیاں لیں۔ منت و خوشامد کی دنیا بھر کی باتیں کیں مگر وہ ٹس سے مس نہیں ہوئیں آخر ہم تھک کر بیٹھ گئے یہ ہماری طرف سے اعتراف شکست تھا، جب ہم نے ہار مان لی تو بیگم صاحبہ نے کرسی سے اٹھ کر ہماری طرف دیکھا آنکھیں سوجی ہوئی تھیں۔ آنسوؤں کے قطرے کچھ آنکھوں کچھ گالوں اور کچھ تھوڑی پر بکھرے ہوئے تھے ہچکیاں لے لے کر انہوں نے عید کی رات سے ننھے کو بخار آنے اور اسکے بیہوش ہو جانے کا قصہ سنایا، "اس کے گھٹری گھٹری ابا ابا کہہ کر خوب کہ اٹھنے کو خوب نمک مرچ لگا کر بیان کیا۔ اور نتیجہ میں ہماری بیوفائی، بچے سے نفرت گھر سے غائب اور دوستوں میں جلسے اڑانے پر خوب صلواتیں سنائیں، ہم نے

ایک ہی سانس میں بیس بائیس بہانے بنائے مگر انہیں پورے واقعات کا علم تھا۔ رشید میاں کے ملازم نے باوجود منع کرنے کے سائیکل گھر پر لا کر دے دی اور یہ بھی کہہ دیا کہ ہم رشید میاں کے ہمراہ گنڈی پیٹھ گئے ہیں وہاں جلسہ ہے رات کو گانا ہوگا، دوسرے روز میاں یحییٰ ملنے آئے تھے۔ رستم علی نے ان سے کہا۔ کہ میاں تو عید کی صبح سے غائب ہیں تو انہوں نے کہدیا کہ اجی عید کی رات کو تو غضنفر علی کے پاس جلسہ تھا، رات بھر وہ بھی ہمارے ساتھ چمپا کا گانا سنتے رہے صبح ناشتہ کر کے گھر کی طرف گئے تھے معلوم نہیں رستے سے کہاں غائب ہو گئے، عید کے دوسرے روز پاشا بھائی ملنے آئے تھے ان سے ہماری بیگم صاحبہ نے ہمارے غائب ہونیکا قصہ فرمایا تو انہوں نے کہدیا کہ میں نے عید کے روز اکسلسیئر کے فسٹ شو میں انہیں دیکھا تھا، بیگم صاحبہ کو یہ ساری باتیں معلوم ہوئیں تو انہوں نے کڑیاں ملا کر عید کی دوپہر عبدالحق کے ہاں بسر کرنا۔ شام سے سنیما دیکھنا، رات کو چمپا کا گانا سننا دوسرے روز صبح وہاں سے چلنا راستہ میں سائیکل ملازم کو دے کر موٹر میں گنڈی پیٹھ جانا سب معلوم کر لیا، تیسرے روز رشید کے گھر پر آدمی بھیجکر دریافت کرایا تو پتہ چلا کہ ہم قلعہ دیکھنے چلے گئے تھے۔ رشید واپس ہو گئے ہیں۔ رستم علی سے کسی نے یہ بھی کہہ دیا کہ ہم نے موٹر میں ایک بی صاحبہ کو بھی ساتھ لے لیا تھا، یہ اطلاع بھی پہنچ گئی۔ بہر حال ہماری پوری کارستانیاں سوا آخری رات کے واقعات کے۔

معلوم ہو چکیں تھیں۔ اور آخری رات کے متعلق بیگم صاحبہ کو یہ یقین تھا کہ ہم نے اسی کے ساتھ قلعہ میں بسر کی جو ہمارے ہمراہ موٹر میں گئی تھی۔ ہمارے جھوٹ بولنے کی کوشش بیکار ہوئی ایک ایک کر کے سب انہوں نے سنا دیئے، اب ہمارے لئے صرف ایک راستہ تھا۔ وہ یہ کہ معافی مانگ لیں اور آئندہ کیلئے وعدہ کر لیں، ہم نے مجبوراً یا دل ناخواستہ یہ بھی کیا، انہیں کی قسم کھائی کہ آئندہ کسی عورت سے نہ ملیں گے۔ اور بلا اجازت کسی جلسے میں نہیں جائینگے ایک گھنٹہ کی منت و خوشامد کے بعد کہیں اُن کے آنسو تھمے۔ اور انہوں نے "عید کی ملاقات" کی تین بجے کھانا نصیب ہوا کھانا کھا کر کمرے سے باہر چلی گئیں۔ اپنی والدہ بہنوں سے لے کر ماماؤں چھوکریوں تک سے ہماری اس منت و خوشامد اور قول و قسم کا تذکرہ کر دیا، دونوں نیک بخت سالیاں تو مدت سے ہم پر جلی ہوئی تھیں۔ انہیں موقع ہی ملا، ایک کو کروشیا کا سٹ اور دوسری کو "پھندے" دے کر سمجھانا چاہا۔ مگر باوجود دونوں نے دونوں چیزوں پر قبضہ کرنے کے ہمارا شکریہ تک ادا نہیں کیا بلکہ بنائے گئیں ساڑھے پانچ بجے بڑی بی ٹہلتی ہوئی کمرے میں آئیں ہم نے جھپٹ سلام کیا بلائیں لیں، دعائیں دیں، دالان میں سلامی کی کشتی رکھکر آئی تھیں وہ منگوا دی اور جاتے جاتے "آج تو آپ کو گانے والے کی دعوت نہیں ہے" پوچھ کر ایک چرکا دیتی ہوئی تشریف لے گئیں۔ مگر اُن کے آنے سے اتنا فائدہ ضرور ہوا کہ ہماری

دونوں نیک بخت سالیاں چپکے سے کھسک گئیں۔ بڑی بی نے خود جاکر
بیگم صاحبہ کو بھیج دیا۔ ہم دونوں نے ساڑھے آٹھ بجے رات تک ترکی
گنجفے سے دل بہلایا۔ پھر کھانا کھا کر سو رہے۔

یہ حال ہے ہم بدنصیبوں کا اور یوں ہوتی ہے "خانہ داماد ونکی عید" خیر!

"بر سرِ دامادِ آدم ہر چہ آید بگذرد"



ہم مضمون کیوں نہیں لکھتے

ہمارے لئے سب سے آسان کام دو ہیں۔ ایک تو مضمون لکھنا اور دوسرے گلی کوچوں میں پھرنا۔ مگر بدنصیبی دیکھئے کہ یہ دونوں کام ہم کر نہیں سکتے۔ ادھر ہم نے کھنکارتے ہوئے سگرٹ جلایا اور کرسی کھینچ کر میز کے سامنے بیٹھنے کا ارادہ کیا اُدھر وہ "ہوشیار" ہو گئیں۔ پہلے تو کن انکھیوں سے ہماری طرف دیکھا، کچھ مسکرائیں اور پھر ایک خاص انداز سے انگڑائی لے کر ہماری طرف متوجہ ہو گئیں۔ اگر ہم نے نہایت شرافت سے کرسی پر بیٹھ کر میز کو انگلیوں سے ٹھوکنا شروع کیا اور تال سُر سے ٹھیک ہو کر۔

جب تم چلو زمین چلے آسماں چلے

گانا شروع کر دیا تو انہوں نے نہایت متانت سے مسکراتے ہوئے منہ پھیر لیا۔ ورنہ ہم میز پر سے کاغذ لیکر قلم اٹھانا چاہیں تو بس غضب ہو گیا۔ ناک بھوں چڑھا کر گھورنا شروع کیا، سانس پھول گیا، چہرے پر سرخی دوڑ گئی

ہونٹ کانپنے لگے اور انھوں نے تن کر دیکھنا شروع کیا۔ اس پر بھی اگر ہمنے فونٹن پن سنبھال کر لکھنا ہی شروع کر دیا تو بس وہ آپے سے باہر ہو گئیں۔ نہایت تیزی سے اٹھکر ہمارے برابر آگئیں اور کھڑی ہو کر لگیں سروجنی نائیڈو کی طرح نہایت فصاحت اور بلاغت سے خطبۂ صدارت ارشاد فرمانے۔ مگر یہ خطبہ لیڈیز اینڈ جنٹلمین سے نہیں بلکہ "خبردار پھر تم نے لکھنا شروع کیا" سے شروع ہوتا ہے۔ اگر اسوقت بھی ہم نے بکمال سعادت مندی کاغذ رکھ دیا اور قلم پھینک کر انکی طرف توجہ کی اور دونوں ہاتھ تھام کر

تجھکو بٹھا کے سامنے یاد خدا کروں

گانا شروع کیا تو پھر اُن کا غصہ بھی غائب۔ ورنہ خطبۂ صدارت بکمالِ زور و شور جاری رہا۔ اس میں نہ تو کھدر پوشی پر زور دیا جاتا ہے اور نہ نمک خوری یا قانون شکنی پر، بلکہ اپنے احسانات محبت، وفاداریاں اور خدمات گنائی جاتی ہیں اور پھر ہماری احسان فراموشی، بے التفاتی، غیر وفاداری، عدم توجہی، اور بے خبری وغیرہ عنوانات پر ایک بسیط نظر ڈالی جاتی ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ دماغ میں آئے ہوئے خیالات سب رفو چکر ہو جاتے ہیں اور ہم نہایت ہی سادہ لوح بنکر یہ سوچنے لگتے ہیں کہ کس طرح اس بلا سے نجات حاصل کیجائے۔ جب تک ہم کاغذ اور قلم پھینک کر معافی نہ مانگ لیں وہ نہیں مانتیں۔

کہئے اب ایسی حالت میں ہم کیا لکھیں؟ بھیّا شاہد احمد مدیر رسالہ
"ساقی" سے مدت ہوئی ہم نے وعدہ کیا تھا کہ "ساقی" کیلئے خوش مذاقی
(لائٹ ہیومر) لکھنا ہمارے ذمے مگر یہاں لکھنے کی اجازت بھی تو ملے۔ ہمنے
انہیں سمجھایا کہ دیکھو بھیّا شاہد ہمارے دوست ہیں جس زمانے میں مولوی
بشیر الدین احمد مرحوم رائچور کے اول تعلقدار تھے اسی زمانے ہمارے والد مرحوم
وہیں پر صدر خزانہ دار تھے۔ ہم دونوں کا بچپن ایک ہی جگہ گذرا۔ ہمارا فرض
ہے کہ شاہد بھیّا کے رسالے کیلئے لکھتے رہیں مگر انھوں نے سب سنکر کہا تو یہی کہ
کیا دنیا میں ایک آپ ہی مضمون نگار رہ گئے ہیں۔ آپ نہ لکھیں تو ساقی میں
کوئی بھی نہیں لکھے گا؟ کہئے اب ہم کیا جواب دیتے؟
شاہد صاحب الگ بگڑے بیٹھے ہیں کہ ہم "ساقی" کیلئے کچھ نہیں لکھتے
اور ان کے بھائی مبشر جدا خفا ہیں کہ باوجود مجبور کرنے کے مضمون نہیں بھیجتے
شاہد صاحب کو ایسی مجبوری نہیں۔ ماشاء اللہ سے بھابی صاحبہ خود تعلیم یافتہ
اور ادبی مذاق رکھتی ہیں "ساقی" یقیناً انکی اجازت سے جاری ہوا ہوگا!
مبشر صاحب تو بلاؤں میں پھنسے ہی نہیں کہ "زن مریدی" کیا چیز ہے؟ اسی لئے
دونوں حضرات ہمیں پر الزام دھرتے ہیں انہیں کیا معلوم کہ
ہماری بیوی ہم کو بات تک کرنے نہیں دیتی
اسکی وجہ یہ نہیں کہ وہ جاہل ہیں اجی حضرت وہ خاصی پڑھی لکھی ہیں۔ فارسی اردو

اور فوری انگریزی بھی پڑھ لیتی ہیں۔ فارسی میں مجلّہ ارمغان (طہران) کا مطالعہ فرماتی ہیں۔ دیوان حافظ کا اکثر مطالعہ فرمانے کے علاوہ فال بھی دیکھ لیتی ہیں۔ ایران کی اور مطبوعات بھی کبھی کبھار پڑھ لیتی ہیں اکثر فارسی کے شعر یاد ہیں۔ کبھی ہم نماز پڑھتے ہیں تو گنگنانے لگتی ہیں ؎

چوں زمیں سجدہ کردم ز زمیں ندا بر آمد
کہ مرا خراب کردی تو ز سجدۂ ریائی

خیام نیشاپوری کی اکثر رباعیات برزبان ہیں۔

تو نیز چنانکہ می نمائی ہستی

تو بس ورد فرماتی رہتی ہیں اور

ہزار خندۂ کفر است بر مسلمانی

تو بس تکیہ کلام ہے۔ اسی طرح عربی کے جملوں کے جملے اور ٹکڑوں کے ٹکڑے ازبر ہیں بھلا ایک دو ہوں تو گناؤں۔ مختصر یہ کہ بیوی صاحبہ عربی دانی میں ابو الکلام کی ثانی ہیں تو فارسی دانی میں آقا داعی الاسلام کی ہم پلہ ہیں۔ اردو تو ماشاء اللہ مادری زبان ہی ہے لب و لہجہ ایسا عمدہ کہ

"آپ سنئے تو پھڑک جائیے گا"

بالکل پنجابی لہجہ "نے" کا استعمال غلط ہو نہیں کرتیں۔ مگر سخت لہجہ ضرور اختیار کر لیتی ہیں یہ صرف ہم سے گفتگو کرتے ہوئے ورنہ کسی اور سے بات چیت ہوگی تو وہ

"ہنواں" کا لہجہ اختیار کرلیں گی۔ اور "ارے سے، ورے سے، ہنیاں اور ہنواں سے لیکر "کیچ" تک بولیں گی۔ اردو کا مطالعہ اتنا وسیع ہے کہ شرر کے ناول اور داستان امیر حمزہ کی ساتوں جلدیں اور پھر طلسم فتنۂ نور افشاں، طلسم حیرت بالا باختر کوچک باختر ایرج نامہ۔ تورج نامہ اور نوشیروان نامہ سبھی چاٹ گئی ہیں سرشار کی تالیفات کا ملاحظہ بھی ہوچکا ہے حکیم محمد علی سے لیکر لکشمندت عابر اور کمندا گوہر کے ناول تک پڑھ ڈالے ہیں۔ تیرتھ رام فیروز پوری کے ترجمے اب بھی پڑھتی ہیں ظفر عمر کا ناول "لال کٹھور" طبع ہوا تو منگوایا مگر آدھے تک نہ پہنچی تھیں کہ پھینک دیا فرمانے لگیں "نیلی چھتری" اور "بہرام کی گرفتاری" کے لکھنے بعد "لال کٹھور" جیسا ناول لکھکر ظفر عمر نے اپنی ادبی اسپرٹ کے تباہ یا مفقود ہوجانے کا اعلان کردیا اب تو انکی اردو بھی لنگڑاتی ہے۔" کہئے ایسی بے پناہ تنقید نگارہ کو کیا آپ جاہل سمجھیں گے؟

"وہ" اخبار صحیفہ، اخبار مشیر دکن اور اخبار رہبر دکن سبھی دیکھتی ہیں۔ صحیفہ کی مقامی میں ایک مبتلا وفوت اور چار مسافر وار دیا سمت افضل گنج میں ایک سائیکل سوار نے ٹکر دی تھی بر سر موقع گرفتار کرلیا گیا اور بوندا باندی، ابر آرائی وغیرہ دیکھ کر بہت خفا ہوتی ہیں انہیں تو ایسے جملے اور فقرے جو صحیفہ میں لکھے گئے ہیں، زبانی یاد ہیں۔ مشیر دکن کے لیڈنگ آرٹیکل سے تو انہیں نفرت ہے سارا اخبار پڑھ لیں گی مگر لیڈنگ آرٹیکل دیکھنا تک پسند نہیں کرتیں اخبار رہبر دکن

کے بعض مخصوص مقالے وہ غور سے پڑھتی ہیں۔ مگر بعض تراجم کو ایک نوٹ بک
میں درج کرنے کیلئے مجھے کہا کرتی تھیں "چو قومہ یا چو قومی" اور "وقت نامہ"
وغیرہ الفاظ جو انگریزی الفاظ کے ترجمے ہیں انہیں یاد کر کے ہنستی ہیں۔ یہ ہیں ہی
یہ دلچسپ بد حواسیاں، چاہے وہ صحیفہ کی ہوں یا شیر کی یا رہبر کی۔

یہ تھی انکی ناولی اور اخباری مصروفیت۔ اب ذرا رسالوی مصروفیت
کو ملاحظہ فرمائیے۔ "معارف" سے لیکر بلند شہر کے رسالہ رفیق تک کو اور "نور جہاں" سے
لیکر "عصمت" تک کو ہر مہینہ بلا ناغہ ملاحظہ فرماتی ہیں۔ آرٹ سے اس قدر ذوق
ہے کہ "چاند" "نیرنگ خیال" "عالمگیر" وغیرہ کی رنگین اور عمدہ تصویروں کو رسالہ
آتے ہی نکال کر فریم کرا کر دیوار پر لٹکا دیتی ہیں بعض انگریزی اخبارات کے
"انیول" محض تصاویر کیلئے منگواتی ہیں۔ انگریزی صرف اس قدر جانتی ہیں کہ
لفافے کا پتہ پڑھ لیتی اور تصویر کے نیچے کا نام سمجھ لیتی ہیں۔

کہئے اب تو آپ تعلیم یافتہ سمجھ لیں گے۔ نہ صرف یہی بلکہ حساب بھی لکھ لیتی
ہیں۔ دھوبی کو کپڑے لکھ کر دیتی ہیں اور ہمیشہ دو تین کپڑے زیادہ لکھدیتی ہیں
یا کم۔ مگر لکھتی ضرور ہیں خط بھی خراب نہیں لمبے لمبے حروف بالکل ایسے ہی لکھتی ہیں
جیسے کہ بہزاد ہند مسٹر چغتائی لکھا کرتے ہیں۔ شاعری سے بھی بہت لگاؤ ہے۔ کبھی
کبھی شعر بھی کہتی ہیں مگر سنانے سے نفرت ہے اساتذہ کے دواوین برزبان
ہیں۔ خاقانی اور دلی سے لیکر اقبال اور فانی تک کا کلام سن لیجئے اکبر کے تو

سینکڑوں شعر یاد ہیں۔ خاصی انشا پرداز بھی واقع ہوئی ہیں مدت ہوئی آپ نے ایک کتاب بھوپال سے منگوائی تھی جس کے دو حصے تھے مگر وی پی کھولا گیا تو ایک ہی حصہ نکلا قیمت دونوں حصوں کی وصول کر لیگئی تھی اس بے ایمانی پر جو غصہ آیا تو آپ نے دو نوٹ پیپر سیاہ کر دیئے اس کا ماحصل یہ تھا کہ "آپ نے دونوں حصوں کی قیمت کا وی پی کیا مگر پارسل میں ایک ہی حصہ رکھدیا۔ اس بے ایمانی سے نہ آپ امیر ہو جائیں گے نہ ہم غریب" مگر یہ قصہ ہے جب کا کہ ہم ان کے پلے نہیں باندھے گئے تھے شادی ہونے سے پہلے کا مگر اب تو خاصی ادیبہ ہو گئیں ہیں۔

حافظہ اتنا اچھا ہے کہ اپنی تسمیہ خوانی سے لیکر اب تک کے پورے واقعات (بلا تعین تاریخ و سنہ) یاد ہیں۔ ہم اگر کچھ کہدیں تو کنقش الحجر ہو جاتا ہے مگر وہ لڑائی جھگڑے کی بات ہو تو ورنہ کوئی کام یا فرمایش یاد ہی نہیں رہتی اگر ہم دفتر کو جاتے ہوئے کہتے ہوئے جائیں کہ دیکھو ہمیں شام کو دعوت میں جانا ہے۔ کوئی سفید شیروانی نکال کر گنڈیاں لگا دینا اور کسی رنگین قمیص کے بٹن بھی دیکھ لینا اور ایک دستی (رومال) بھی نکال دینا۔ تو وہ نہایت ہی متانت سے اچھا ضرور کہدینگی مگر ہم دفتر سے آکر چائے پینے کے بعد جب شیروانی اور قمیص مانگیں گے تب کہیں اٹھکر حیسٹ ڈرا کھولیں گی۔ اور اگر پوچھ لیا کہ دوپہر میں کیوں نہیں نکالا تو معصوم صورت بنا کر کہدیں گی کہ "بھول گئی تھی" اسی طرح ہمارا ہر کام

بھلا دیا جاتا ہے۔

لاحول ولا ہم کہاں سے کہاں آ پہنچ گئے ہاں تو حضرت بات دراصل یہ ہے کہ

لطیف بود و حکایت دراز تر گفتم

خانگی معاملات اور گھریلو زندگی کے واقعات پبلک نہ ہونے چاہئیں مگر کیا کیا جائے "نہ یہ ٹانگ کھولوں تو لاجوں مروں وہ ٹانگ کھولوں تو لاجوں" لکھوں تو بدنام ہوں، انکی باتیں سنوں، غصہ سہوں سب کچھ کروں اور نہ لکھوں تو شاہد بھیّا کی نظروں میں بد دماغ، خشک مزاج وعدہ فراموش اور متکبّر ٹھیروں۔ عجیب مصیبت ہے۔ دفتر میں لکھنے کا وقت نہیں ملتا۔ گھر پر وہ لکھنے نہیں دیتیں۔ مکتبہ میں گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ ضرور گذرتا ہے۔ وہاں لکھنے کا ارادہ کرنا مشکل۔ ادھر ہم نے کچھ لکھنا چاہا ادھر عبدالحق صاحب نے چار چھ کتابیں منگوا کر سامنے رکھدیا ایک پان کا بیڑا بازار کا منگوایا ہوا (کیونکہ انکی محترمہ بھی انھیں پان نہیں بھیجتیں) سرکا دیا اور گال پھلا کر فرمانے لگے تمکین! ذرا ان کتابوں کے اشتہار تو لکھدو! چلو چھٹی ہوئی۔ اشتہار لکھتے لکھتے مغرب کا وقت ہو گیا۔ ہم نے سائکل سنبھالی اور گھر کا راستہ لیا۔ اگر مولوی عبدالوہاب پہنچ گئے تو ہم کاغذ کھینچ کر پھینک دیا اور سخت نامعقول ہو کہکر ایک دو گھونسے رسید کر دیئے۔ یا کرسی لڑھکا دی اور لکھنا ختم۔ مگر اب نہ تمہیں اور عبدالحق اپنے لین دین میں مصروف ہوں تو میاں حامد نے اپنے خاص ... آ ...

لہجہ میں حاجیوں کو لیکر جدہ جانے والے جہاز کا قصہ بنگالیوں اور بخاریوں کی گالیاں سناتے ہوئے کہنا شروع کیا۔ پھر کلکتہ کے قیام کے زمانہ کے تجربات عالیات سے معلومات میں اضافہ فرمانے لگے۔ چلو لکھنا ہو گیا۔ کہئے اب کیا کیا جائے۔

بہر زمیں کہ رسیدیم آسماں پیداست

وہاب کی مقشر ڈاڑھی کی قسم ہے کہ ہم چار مہینے سے "ساقی" کیلئے لائٹ ہیومر لکھنے کے خیال میں رہتے ہیں مگر لکھنا نہیں ہوتا۔ آخر سوچتے سوچتے ہم نے لکھ ہی لیا، آپ پوچھیں گے کس طرح سنئے!

آج کل صبح کے دفاتر ہیں۔ ہم ٹھیک پانچ بجے جاگتے ہیں اور ضروریات سے فارغ ہو کر ناشتہ کرکے ٹھیک سوا چھ بجے دفتر چلے جاتے ہیں اور پھر ٹھیک ایک بجے دفتر سے گھر آجاتے ہیں۔ "وہ" بھی ہمارے ساتھ جاگتی ہیں اور ہمارے دفتر سے گھر آتے تک کام کاج میں مصروف رہتی ہیں ڈیڑھ بجے کھانا کھا کر دو بجے ہم سو جاتے ہیں اور وہ بھی فنا فی النوم ہو جاتی ہیں۔ اور پھر پانچ بجے جاگتی ہیں ہم بھی روزانہ دن میں پانچ بجے تک سویا کرتے تھے آج اتفاق سے "وہ" سو گئیں مگر ہمیں نیند ہی نہیں آئی ہم نے کہا چلو "ساقی" کے لئے ہی کچھ لکھ لیں اور بیٹھ گئے کاغذ لیکر۔ اسوقت ساڑھے چار بجے ہیں۔ ٹھیک پانچ یا اس سے کچھ پہلے وہ جاگیں گی۔ اس لئے ہم ابھی سے

مضمون ختم کر دیتے ہیں ورنہ انہوں نے دیکھ لیا تو آفت آجائے گی۔

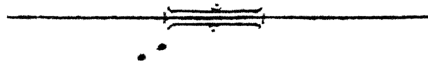
پانچ بجے وہ جاگ کر منہ ہاتھ دھو کر پوچھیں گی تو کہدیں گے کہ تم سے دس منٹ پیشتر جاگا ہوں۔ چلو چھٹی ہوئی، ادھر بھیّا شاہد کی خفگی سے ادھر اُن کے غصہ سے۔

یہ ہے ہمارے مضمون نہ لکھنے کی وجہ ورنہ ہم اور مضمون نہ لکھیں، ناممکن، بھیّا شاہد کو اب تو اندازہ ہو جائے گا کہ ہم کس قدر مجبور ہیں اگر ممکن ہوا تو ہم کبھی نہ کبھی اپنی مجبوری کی وجہ سے وہ تصویر بھی "ساقی" میں شایع ہونے کیلئے روانہ کر دیں گے جو آئے دن گھر میں ہر ایک کو نظر آتی ہے۔ جب کبھی وہ خفا ہو کر ملتی ہیں ہم اور وہ ملکر بیٹھ جاتے ہیں ننھا آ کر گود میں سوار ہو جاتا ہے اور وہ.....

پھر تو یہ منظر رہتا ہے کہ

فوق البشر نشستہ ہے اک شوہرِ غریب مصروفِ غور کف میں زنخداں لئے ہوئے
پہلو میں اسکے اک زنِ گلگوں گداز تن آبِ حیات سینۂ عریاں لئے ہوئے

مصروفِ نوش چشمۂ آبِ بقا پہ ہے
ننھا دہن میں غنچۂ پستاں لئے ہوئے



جھوٹ

اگر مجھ سے پوچھئے تو میں "جھوٹ" کو فنونِ لطیفہ میں جگہ دوں گا۔ اس لئے نہیں کہ وہ بعض وقت انسان کو بچا لیتی ہے۔ بلکہ محض اسلئے کہ اس کے کہنے اور اسکو نباہنے کے لئے بھی خاص دماغ داری اور فطری نفاست کی ضرورت ہے، میں اسے جھوٹ ہی نہیں سمجھتا جو بنہ نہ سکے، جو ظاہر ہو جائے اور جسے کوئی یقین نہ کرے جھوٹ وہ ہے جو نہایت ہی ثقاہت، سنجیدگی اور اطمینان کے ساتھ بلا سوچے سمجھے کہی جائے اور سننے والا اسکو کم از کم واقعہ تصور کرے کہنے والے کیطرف سے بدگمان ہو نہ بدگمانی کا اندیشہ ہو۔

"جھوٹ" کہنے کی مشق کرنی حماقت ہے، فنونِ لطیفہ کی طرح دروغ گوئی کسب سے نہیں آسکتی۔ "تا نہ بخشد خدائے بخشندہ" یہ بالکل فطری اور قدرتی چیز ہے، ہر بچہ ایک تیزی ایک ذہانت ایک چلبلا پن ایک معاملہ فہمی ماں کے پیٹ سے لیکر پیدا ہوتا ہے، والدین اور عزیز و اقارب دوست احباب ملنے

جلنے والوں کی صحبت میں ان چیزوں پر جلا ہو جاتی ہے اور آہستہ آہستہ ہر ایک چیز معراج کمال پر پہونچنے لگتی ہے۔ بد مذاق والدین بچے سے بے تکی جھوٹ یا دھوکہ آمیز گفتگو کر کے اسے جھوٹا بنا دیتے ہیں۔

یوں تو دنیا میں ہزاروں جھوٹے ملیں گے سینکڑوں جھوٹ آپ خود سن چکے ہونگے اور سینکڑوں دفعہ آپ نے خود جھوٹ کہی ہوگی۔ مگر آپ نے اس پر غور نہیں کیا ہوگا کہ یہ ہے کیا چیز؟

یہ ایک تحفہ ہے جو والدین اپنے عزیز لڑکوں کو دیتے ہیں یہ ایک انعام ہے جو استاد اپنے شاگرد کو دیتا ہے یہ ایک تمغہ ہے جو دوستوں کی طرف سے دیا جاتا ہے یہ ایک امانت ہے جو بیوی سپرد کر دیتی ہے۔

بچہ عموماً ماں کی گود میں جھوٹ بولنا سیکھتا ہے۔ مجھ سے گو میری والدہ نے کبھی کوئی بات جھوٹی نہیں کہی مگر کھلائی اور انا کی جھوٹ نے مجھ پر خاصا اثر کیا اور مجھ میں جھوٹ بولنے کی صلاحیت پیدا ہونے لگی۔ بچپن کے آخری اور جوانی کے ابتدائی ایام میں والدین کی سختیاں بڑھ گئیں اور مجھے مجبوراً جھوٹ کہنی پڑی۔ مدرسہ کے برخاست ہوتے ہی گھر نہ پہنچنے پر پرسش ہو تو "جھوٹ" شام میں دیر تک باہر رہنے کی وجہ دریافت ہو تو جھوٹ۔ میوہ خوری یا جیب خرچ کے روپیے جو پہلی کو ملا کرتے تھے، مہینے کے پہلے ہی ہفتہ میں ختم ہو جانے اور دوبارہ مانگنے پر وجہ دریافت ہو تو "جھوٹ" ان دروغ بافیوں نے

اچھا خاصا جھوٹا بنا دیا۔

محرم کا مہینہ ہے مدرسہ غائب کر کے تھوپیک کا رنگ دیکھ رہے ہیں۔ صبح کے گئے واپس ہوتے ہیں تو شام کو وجہ پوچھی تو کہدیا کہ پانچ بجے تک تو مدرسہ میں تھا۔ وہاں سے ذرا مجلس میں چلے گیا تھا اب مجلس سنکر آرہا ہوں چلو چھٹی ہوئی، پانچ بجے چاء پی کر گئے اور رات کے نو بجے تک سینما دیکھتے رہے، واپسی پر پوچھا تو کہدیا۔ ایک ہم جماعت کے والد مر گئے تھے راستہ میں میت نظر آئی تو ساتھ ہو گیا اب دفنا کر سب لوٹے تو میں بھی واپس ہوا۔ چلو بچ گئے، رات کو اگر غائب رہنے کی ضرورت پیش آئی تو پہلے سے یہ کہکر کہ فلاں دوست کے گھر دعوت ہے نیاز ہوگی رات بھر مولودِ شریف بھی ہوگا۔ چلوا جازت مل گئی رات اپنی۔

جیب خرچ میوہ خوری کے روپیوں سے خوب سگریٹ پیئے مدرسہ غائب کر کے بارہ دری گئے وہاں مٹھائیاں اڑائیں اب جو روپیے ختم ہو گئے تو یہ کہکر مطالبہ کیا کہ ڈکشنری کھو گئی تھی ایک نئی خرید لی ہے کاپیوں کیلئے کاغذ اور ڈرائنگ کیلئے برش اور رنگ کا ڈبہ لیا روپیے نہیں رہے چلئے حساب ہوا اور روپیے مل گئے۔ یہ تھا بچپن کا حال۔

جوانی میں شادی ہونے تک یہی حال رہا۔ میلادِ شریف کے بہانے سے ناٹکیں دیکھیں دوستوں کی شادیوں کے بہانے سے گانے سنے کوٹھے لے چلے،

دنیا بھر کے کام کئے۔

شادی ہوتے ہی نگرانی اور سخت نگرانی شروع ہوئی، دفتر سے واپسی میں دیر ہوئی تو پرسش، تفریح سے واپسی میں تاخیر ہو تو جواب طلب، رات کو جانے کی اجازت ہی نہیں اور اگر اجازت کے بغیر غائب رہے تو غضب، آفت، قیامت، اسرہانے سے کنجیاں لیکر بیگم صاحبہ نے اٹاچی کیس کھول لیا اس میں سے روپیوں کا بٹوا غائب، اب صبح مانگئے تو پہلے انکار ہوگا آخر مجبوراً اقرار بھی کیا تو روپیے دینے کا نام نہیں۔ مجبور کرنے پر دیا بھی تو صرف ایک روپیہ چلو سستے چھوٹے، بقیہ روپیئے غائب،

ان آفتوں سے بچنے کے لئے جھوٹ نہ کہئے تو کیا کیجئے، یہ تھوڑا ہی کہہ سکتے ہیں کہ رمضان کی ۲۲ تاریخ کو جلسہ ہے گانا ہوگا۔ یہی بہانا کر دیا کہ فلاں دوست کے لڑکے کی روزہ کشائی ہے، چلو رات بھر غائب رہے، اسی طرح جھوٹ کہہ کہہ کر دن گذارنے پڑتے ہیں۔

مگر اس جھوٹ کا کمال یہ ہے کہ کسی کو شبہ نہ ہو کہ یہ جھوٹ ہے ایکدفعہ صبح گھر سے نکلے تو ایسے بُرے پھنسے کہ تین دن تک گھر لوٹ نہ سکے اب جو واپس آتے ہیں تو قیامت مچی ہوئی کہاں رہے، کدھر رہے؟ کیسے رہے؟ ایسے عجیب وقت میں حواس کا باقی رہنا اور اطمینان کے ساتھ جھوٹ کہنا بھی خاص بات ہے ہم نے نہایت ہی بے اعتنائی سے کہدیا، چچا گھوڑ ریسے

گر گئے تھے۔ "کلم" جیسے تعلقہ پر ڈاکٹر کہاں سیّد میاں کے پاس تار آیا وہ مجھے راستہ میں ملے سیدھے ڈاکٹر صاحب کے پاس گیا اور وہاں سے ساتھ لیکر "کلم" چلے گیا راستہ میں علی میاںؓ مل گئے تو اُن سے ساٹھ (۶۰) روپیہ لئے جو کرایہ میں کام آئے ورنہ گھر تک چکر کرنی پڑتی تھی شکر ہے کہ چچا کی ہڈی جڑ گئی اچھا ذرا پانی نکلوا دو۔ نہا کر کپڑے بدل دوں گا اچھا وہ ساٹھ روپیے بھی دیدینا علی میاںؓ کو بھیج دیتا ہوں۔ چلئے روپئے بھی ملے خاطر مدارات بھی ہوئی اور جلسہ مفت میں رہا۔

جھٹکا

دنیا میں سب سے زیادہ تکلیف دہ سواریاں دو ہیں۔ شمالی ہند کا یکّہ اور حیدرآباد کا "جھٹکہ" چاہے وہ ربڑ ٹائر ہوں یا لوہا ٹائر اور اس میں "خچر" جتا ہو یا "ٹٹو" مگر ہیں بدترین سواریاں۔

چاہے "نام پلی اسٹیشن" (براڈ گیج) پر اتریں یا کاچی گوڑہ اسٹیشن (میٹر گیج) پر دونوں جگہ بھی آپ کو ملے گا تو جھٹکا، اس کے موجد نے نام بھی بڑی دور اندیشی سے رکھا ہے، ایسے جھٹکے (دھکّے) لگتے ہیں کہ توبہ بھلی، خدا کا شکر ہے کہ یہ سواری دکن میں سوا حیدرآباد اور مضافات کے کسی اور جگہ نظر نہیں آتی ورنہ ایک مصیبت تھی۔

برادرانِ دکن تو جھٹکے کے جھٹکوں سے واقف ہیں جن حضرات نے اسکی زیارت نہیں کی ہے وہ کسی رسالے میں (چاہے وہ الہ آباد کا ادیب ہو یا حیدرآباد کا دکن ریویو مگر ہو پرانا) چار مینار کی تصویر دیکھ لیں اس میں

ایک چھوٹی سی کاٹ کی مزار، کسی بابو یا ٹٹو کے سہارے نظر آئیگی۔ وہی جھٹکا ہے۔ آیا خیال شریف میں! یہ بات ابتک میری سمجھ میں نہیں آئی کہ چار مینار کی پرانی تصویریں معہ جھٹکہ سمیت کیوں لگئی ہیں نہ جانے اس زمانے میں جھٹکا چار مینار بنا ہوا تھا یا چار مینار جھٹکا! خیر!

حیدر آباد میں چھکڑے، موٹر، بگھی، (بہمہ اقسام) رتھ، شکرم، ٹانگہ، بنڈی، سبھی کچھ موجود ہیں مگر کثرت ہے تو جھٹکے کی ڈولیاں اور میانے بھی تھے۔ مگر اب ڈولی نظر نہیں آتی۔ میانے صرف شادیوں میں دکھائی دیتے ہیں، رتھیں صرف سرکاری رہ گئی ہیں۔ امراء کے پاس ہی تھیں مگر اب نہیں رہیں، شکرمیں بگھیوں اور موٹروں کی کثرت کی وجہ گھٹتی جارہی ہیں برقعہ گاڑی دکن میں رائج ہی نہیں رہی اورنگ آباد میں کسی زمانے میں نظر آتی تھیں، ابتو وہاں بھی نہیں!

موٹروں کی یہ کثرت ہوگئی ہے کہ روشن خیال نوجوانوں سے قطع نظر میانہ نشین بوڑھے بھی اب موٹر پر نظر آتے ہیں۔ ٹکسی کو پوچھئے نہیں جھٹکوں سے زیادہ تعداد میں موجود ہیں "لاری" اور "بس" بھی ان گنت ہیں مگر پھر بھی جھٹکے کم نہیں ہوتے "فلک نما" سے "سکندر آباد" تک چلے جائیے جھٹکے ہی جھٹکے نظر آئیں گے۔ حیدر آباد کا متوسط طبقہ جسے لوگ سیکنڈ کلاس بھی کہتے ہیں، جھٹکہ نشین ہے، جسے دیکھئے جھٹکے میں لدا ہوا

نظر آئے گا۔

ہماری صفائی بلدہ (بلدیہ) بھی ستم ظریف ہے۔ سال میں ایک دفعہ نمبر اندازی ہوتی ہے۔ جھٹکہ کا ٹیکس لیکر جھٹکہ والوں کو بلّہ چھٹی (پاس) دیا جاتا ہے اور اس زمانہ میں نگرانی کی جاتی ہے ہر جھٹکا دلہن نظر آتا ہے کبھی دفتر صفائی میں چلے جائے تو یہ دلچسپ تماشا بھی نظر آئے گا۔ اسیسر صاحب میدان میں کھڑے ہوئے ہیں۔ انسپکٹر بھی پہلو میں ہے وہ ایک پولیس کانسٹبل بھی موجود ہیں۔ ایک ایک جھٹکا آتا ہے، ڈھانچہ گدّیاں یا پو ساز و سامان سبھی چیزیں دیکھی جاتی ہیں۔ ان پر نمبر لگایا جاتا ہے۔ یا پو کو دوڑا کر بھی دیکھ لیا جاتا ہے۔ جھٹکہ والے کا خاکی ڈریس بھی ملاحظہ ہوتا ہے اور فیس (ٹیکس) لیکر ایک ٹین کا مربع پلیٹ جس پر "صفائی بلدہ سنہ ۱۳۴۴ف درجہ چہارم نشست چہار اشخاص ۱۰۰۲۲۲۲" لکھا ہوتا ہے اور ایک پیتل کا ٹکڑا جسکے دونوں بازوؤں پر سوراخ ہوتے ہیں اور اس پر بھی یہی عبارت منقوش ہوتی ہے اور ایک "شرح کرایہ کا تختہ" جسکا ترجمہ ہمارے ایک دوست نے کرایہ نامہ کیا تھا دیا جاتا ہے۔ چلو خوشی خوشی جھٹکا چلا۔ اس نمبر اندازی کے زمانے میں جھٹکا والی مخلوق "بڑی بڑی جدّتیں کرتی ہے کوئی تو نہایت بہترین ریشم کے پردے ڈال دیتا ہے۔ ساز و سامان اور جھٹکے کو نہایت شوخ رنگ دیتا ہے گھوڑے کی خوش نصیبی سے اگر سفید ہو تو دُم، سر، پاؤں، رنگ کر ترنج کلیاں بنا دیتا ہے۔

دروازے پر ویلکم یا خوش آمدید لکھوا دیتا ہے۔ بہرحال اس زمانہ میں جھٹکہ
عجیب نظر آتا ہے،
کر ادہر ٹیپر پڑا اور ادہر آہستہ آہستہ سب چیزیں غائب ہوئیں اونگھتا
ہوا گھوڑا اور نیم بے ہوش، جھٹکا والا اور جھٹکا ایسا مخدوش اب گرا کہ گرا ایسی
میں سواری ہو رہی ہے ؎

علی الصباح چو مردم بکار و بار روند
بلاکشانِ دفاتر بہ رو بکار روند

ان غریبوں کو اسی جھٹکہ میں جانا پڑتا ہے دو دو آنے کرایہ کر کے تین
شخص لد جاتے ہیں اور دفتر پہونچ جاتے ہیں سب سے دلچسپ چیز جھٹکا والا
ہوتا ہے انکے کئی اقسام ہوتے ہیں اور اپنی اپنی قسم کے لحاظ سے ان میں
دلچسپی ہوتی ہے۔

(۱) نوجوان لڑکے جو چند روز بھیک مانگنے اور کسی ہوٹل میں نوکر رہکر
نکالے جانیکے بعد "آوارہ گردی" کی علت میں چالانِ عدالت ہوکر جھٹکا چلانے
والے، یہ عموماً اکھڑ، غصیلے، فطرت کے لحاظ سے لڑاکو اور شریر ہوتے ہیں۔
کرایہ داروں سے لڑنا گالی گلوچ کرنا انکے لئے معمولی بات ہوتی ہے۔

(۲) پہلی قسم کے متوسط عمر والے جو زیادہ دنوں تک جھٹکا چلا کر تجربہ
کار ضرور ہو جاتے ہیں مگر پرانی عادتیں انہیں بھی موجود ہوتی ہیں!

(۳) نوکری نہ ملنے کی وجہ یا اپنی سستی یا کاہلی کی وجہ جھٹکا چلا کر گذر بسر کرنیوالے یہ لوگ پہلے اور دوسرے طبقے کے جھٹکے والوں سے زیادہ سنجیدہ اور غنیمت ہوتے ہیں۔

(۴) تجربہ کار، جہاندیدہ، معمر، باتونی، ہنر یافتہ، افیونی جھٹکے والے یہ بڑے دلچسپ ہوتے ہیں۔ آپ کسی چوتھی قسم کے جھٹکے والے کو دیکھکر اسکے جھٹکے میں سوار ہو جائیے اور پھر نہایت آہستگی سے پوچھ لیجئے کہ "ملازم ہو یا ذاتی جھٹکا ہے؟" بس اس نے اپنی ساری کہانی شروع کی، از آں وم تا ایں دم ایک ہی سانس میں ساری کہانی سنا دیگا۔ اور بیچ بیچ میں ایسے ایسے دلچسپ حالات، واقعات اور حکایات بھی سناتا جائے گا کہ آپ حیران ہو جائیں گے۔ موسیٰ ندی کی طغیانیاں، طاعون کے دورے سے لیکر انفلوئنزا، ملیریا، قحط، آرایش بلدہ، ہائیکورٹ، سول ہاسپٹل وغیرہ کی تعمیر، ڈیوک آف کناٹ، پرنس آف ویلز، اور چار چھ وائسرائے کی آمد کے جلسے، نمایش، ناٹک، سینما، سرکس سے لیکر گنڈی پیٹ اور حمایت ساگر کی تعمیر تک کے دلچسپ حالات سن لیجئے، ہر ایک موضوع پر بلا تکلف گفتگو کرنے والا غیر تعلیم یافتہ اگر کوئی بل سکتا ہے تو وہ جھٹکا والا اور صرف جھٹکا والا ہے۔

خاص خاص لوگوں کے ذاتی حالات، عادات و اطوار، چال چلن، تمدن و معاشرت کے متعلق کروڑ ہا قصے سن لیجئے اس سے بحث نہیں کہ وہ خواہ مخواہ

صحیح ہی ہوں۔ مگر اس نفاست سے سنائے جائیں گے کہ سننے والا زبردستی یقین کرلے گا۔

مجھے عموماً وحشت ستاتی ہے۔ جب شدت کا دورہ ہوتا ہے تو میں کسی قسم چہارم کے جھٹکے والے کو تاک کر جھٹکے میں بیٹھ جاتا ہوں اور اس سے کوئی ایک سوال پوچھ کر بیٹھ رہتا ہوں۔ بس گویا گراما فون کو کوک دیا سنتے جائیے یہاں تک دلچسپی پیدا ہوجاتی ہے کہ خفقان رخصت ہوجاتا ہے ''دیب روتا'' شربت کے شیشے ٹنکچر ڈنے، جی، ٹینا، کے بڑے بڑے خوراک بھی خفقانکو اس قدر جلد نہیں روک سکتے۔ جتنی تیزی سے کہ ایک جھٹکے والا اپنی دلچسپ اور مزیدار گفتگو سے روک دیتا ہے۔

مئی کے تیسرے ہفتے میں گرمی شدت کی تھی، غالباً جمعہ یا اور کسی تعطیل کا روز تھا۔ مجھے خفقان نے آلیا۔ بارہ بجے سے تین بجے تک تو گھر پر پڑا رہا جب خانہ نشینی خارج از اختیار ہوگئی تو ع

چھڑی ہاتھ میں لیکے گھر سے نکل

چارمینار کی طرف چلا۔ میدان کے چوک سے وزیر علیؒ پاشا کی ڈیوڑھی تک بیسوں جھٹکے کھڑے تھے مگر کوئی جھٹکے والا مطلب کا نظر نہ آیا۔ سوکھے حوض کے پاس سحر باطل کی کمان کی طرف چند جھٹکے کھڑے ہوئے نظر آئے، ایک ایک کو دیکھتا ہوا کمان تک چلا پہنچا۔ ایک نہایت میلا کچیلا فرسودہ از کار رفتہ

رنگ پریدی، گدیاں پارہ شدہ جھٹکا نظر آیا جس کا یا تو زور زور سے سانس لیکر یہ ضرور ظاہر کر رہا تھا کہ آخری سانس لے رہا ہے مگر نہ تو آنکھیں ہی کھلی ہوئی تھیں اور نہ ہڈیوں پر گوشت ہی تھا۔ ویٹیزی کلاس کے طلباء کے سامنے لیکچر دینے کیلئے اس سے عمدہ ڈھانچہ جسکی ہڈیاں بآسانی گنائی اور دکھائی جاسکتی ہوں اور کوئی نہ مل سکتا تھا۔ لطف یہ کہ اس "کاٹ کی مزار" میں ایک نہایت معمر ہستی مصروف مراقبہ تھی۔ چھوٹا سا قد، خاصا کالا رنگ، چھوٹے چھوٹے ہاتھ پاؤں رگیں ابھری ہوئیں ہڈیوں کے سوا کسی حصہ جسم پر گوشت کا نام نہیں۔ کثرت ریاضت سے کمر جھکی آنکھیں اندر کو دھسی ہوئی گال چپکے ہوئے۔ تھوڑی پر گنتی کے چند بال بعض سفید بعض کالے باریک باریک مونچھ کانوں کی لوئیں پلٹی ہوئیں۔ ایک کالے کرتے پر سرخ صافہ (شملہ) باندھے جھٹکے کے ایک کونے میں یہ گٹھری کچھ اسطرح رکھی ہوئی تھی کہ ع

ڈاڑھی بھی جو ملتی تھی تو ہوتا تھا گماں اور

پہلے ہمنے جھٹکے کے تختے کو چھڑی سے ٹھونکا۔ پھر یکے بعد دیگرے کئی آوازیں دیں مگر ع

کچھ ایسا سویا تھا سونیوالا کہ جاگنا حشر تک قسم تھا

آخر ہم نے غریب گھوڑے پر چھڑیاں چلانی شروع کیں۔ چار چھ چھڑیوں کے رسید کرنے کے بعد گھوڑے نے ایک جھرجھری لی۔ گردن

سیدھی کی اور آہستگی سے پیچھے ہٹنا شروع کیا۔ پے در پے چار چھ دھکّے لگنے کے بعد جھٹکہ والے نے آنکھیں کھولیں۔ بیک لفظ میں پچیس مغلظات گھوڑے کو سنا دیں اور پھر ہماری طرف متوجہ ہو کر پوچھا، میاں جھٹکہ لاؤں؟ ہم نے گردن کے اشارے سے ہاں کہہ دی۔ بڑے میاں نے سنبھل کر شملہ (صافہ) ٹھیک کیا۔ جسمیں سے ایک کاڑیوں کی ڈبّی، ایک چار مینارہ سگریٹ کی ڈبی ایک کٹہ یا دگیری بیڑی کا گدیوں پر گر پڑا۔ شملہ باندھنے کے بعد یہ تینوں چیزیں پھر شملہ ہی میں ٹھونسی گئیں۔ گدیاں جھٹکیں، چابک ڈھونڈ ڈھانڈھ کر ہاتھ میں لیا۔ اور دروازہ کھول کر ہماری طرف دیکھنا شروع۔ ہم نے سوار ہو کر دروازہ کا بولٹ لگا دیا۔ اور بڑے میاں نے پوچھا۔ میاں کدھر چلوں۔ ہم نے پہلے تو کچھ سوچنا چاہا۔ مگر نہ جانے کیا بات ہوئی کہ یکایک زبان سے نکل گیا "کاروان" بڑے میاں نے جھٹکا پلٹایا اور گھانسی کے بازار محبوب کی مہندی کا چکّر دیکر حسینی علم کی سڑک پر پہنچے اور اطمینان سے بیٹھکر گفتگو شروع کی کہنے لگے۔

"میاں! مہندی[1] کے موڑ پر آپ نے تبنبیوں (کھڑکیوں) والا مکان دیکھا۔ اس میں باہر والی ایک کسبن (کسبی) آکر ٹھیری ہوئی ہے۔ صورت تو کچھ اچھی ہنیں مگر آنکھیں غضب کی ہیں۔ بڑی صاحب جان کے بعد میں نے آنکھیں دیکھیں تو بس اسی کی۔ گاتی بھی اچھا ہے۔ ناچتی بھی ہے مگر کوئی خاص بات ہنیں ہے۔ لوگ اسی پر ٹوٹے پڑتے ہیں۔ آٹھ دس دن سرورنگر میں تھی

[1] زبان کے ذمہ دار ہم نہیں جملہ حقوق بحق جھٹکہ والا محفوظ۔

نواب .... نے بلا لیا تھا۔ ہزاروں لیکر آئی ہے مگر میاں جاتے وقت جو رونق منہ پر تھی اب نہیں رہی۔ ہزاروں روپے چپ (مفت) تھوڑا ہی ملتے ہیں۔ آوتی ہوکر آئی ہے یہاں کوئی بھی کسبن اچھی آجائے تو یہی حال ہوتا ہے اجڑے گاؤں میں۔ یہی سہاگن کا حال ہے شہر میں کسبنیں دکھیاں ہیں کہاں ہیں تو ایک بھی نہیں یہ بھول ہی کی بات ہے کہ چار مینار کے چاروں کونے آباد تھے۔ صبح سے شام تک بنگلوں (کوٹھوں) پر کسبن ہی کسبن نظر آتی تھی۔ مگر ان پولیس والوں نے غریبوں کو نکالا۔ بیگم بازار، ساندی عنبر کا بازار، موسیٰ باؤڑی (باؤلی) پر جاکر رہیں۔ مگر عماد جنگ بہادر نے وہاں بھی چین لینے نہ دیا وہ وہ تکلیفیں دیں کہ ایک ایک کر کے سب بھاگ گئیں جو بچیں وہ مر کھپ گئیں۔ ہائے میاں اجارجی کا طائفہ۔ کالی جان کا گھرانا، صاحب جان کا طائفہ موتی جان کا بنگلہ سب تباہ ہو گئے۔ ظالموں نے ایک کو بھی نہیں چھوڑا اب دو چار کالی پیلیاں سدی عنبر کے بازار میں اور چار چھ گولی گوڑے میں، دو ایک بیلے میں رہگئی ہیں۔ باقی اللہ اللہ خیر سلا۔ وہ بھی کسی کام کی نہیں رہیں نہ تو گانا آتا ہے اور نہ ...... صورت نہ شکل باہر سے آجاتی ہیں تو سال چھ مہینے خوب قدر ہوتی ہے مگر اس کے بعد لوگ ستانے لگتے ہیں اور وہ ٹکنے نہیں پاتیں۔ یہ بی جان جو اب آئی ہوئی ہیں چند ہی روز میں ایسی بھاگینگی کہ پلٹ کر نہیں دیکھینگی۔"

پہلے زمانہ میں ہر رسم میں شادی ہو چاہے بسم اللہ ہو کسبیوں کا رہنا لازمی تھا۔ براتوں کے ساتھ "تختِ رواں" رہتے تھے، اس پر طائفے کے طائفے ہوتے۔ ورنہ ہاتھیوں پر کسبنیں بٹھادی جاتی تھیں، کیسے کیسے دھوم کی باراتیں نکلتی تھیں۔ آخری شادی دھوم دھام سے بس نواب مظفر جنگ کی ہوئی تھی اس کے بعد سے ابتک کوئی دھوم دھام کی شادی دیکھنے میں نہیں آئی۔

درگاہوں کے جھگڑے بھی موقوف ہوگئے وہاں تو کسبنیں پھٹکنے بھی نہیں پاتیں۔ ہولی دیوالی میں سیٹھ ساہوکاروں کے پاس بھی گانے کا دستور نہیں رہا۔ چار بجلی کے گولے لگائے اور گراما فون لگا کر بیٹھ گئے دیوالی ختم شادیوں میں بڑی دھوم دھام کی تو ایک قوالی کی چوکی بلوا لی بس ...... ناٹک ایسی نکلی کہ ان غریبوں کی آمدنی بیٹھ گئی۔ پہلے جب ناٹک تھی نہ سنیما تھے لوگ مغرب کے بعد ٹہلتے ہوئے بنگلوں پر چلے جاتے تھے بیٹھکر گانا سنتے آٹھ نو بجے گھر واپس چلے جاتے!

آجکل لوگ گھر سے نکلتے ہیں تو سیدھا ہوٹل کو جاتے ہیں یا سینما دیکھکر نو بجے گھر کو پہنچ جاتے ہیں وہاں گانا اور ناچ بھی ہوتا ہے۔ بعض سینما والوں نے دو دو تین تین چھوکریاں بلالی ہیں، انہیں ناچنا گانا سکھادیا ہے۔ بھلا یہ دھیڑنیاں کیا ناچینگی؟ سینما میں انہیں کو نچوا گوا دیتے ہیں لوگ

اسی پر خوش ہیں۔ کہیں مس تارا کا ناچ ہے تو کہیں مس موہنی کا جا کر دیکھو تو غصہ آنے لگتا ہے۔ کاماٹی پورے سے مُریوں کو لا کر مس مس بنا ڈالا۔ لوگ ہیں کہ اسی پہ مٹے ہوئے ہیں۔"

"میاں! آپ لوگ بھی آجکل کے بچے ہیں۔ کسبنوں کو بُرا سمجھتے ہونگے مگر میاں سدا سہاگن بچی ہوتی ہیں یہ بھی۔ دیکھو نا اِدھر چار مینار سے کسبنیں نکالی گئیں اُدھر جھاڑو تارا نکلا، اُدھر دُمدار ستارا نکلا، اِدھر تارا نکلا، اُدھر مرحوم سرکار نے انتقال کیا۔ اس کے بعد سے طاعون، ہیضہ، ملیریا، انفلوئنزا، نمونیا، قحط، الا بلا سبھی آنے لگے۔ سچ کہتا ہوں جھوٹ تو نہیں کہہ رہا ہوں اب دکانیں بہت زیادہ ہوگئی ہیں۔ لوگ بھی بہت بڑھ گئے ہیں۔ سٹریٹ ہر سجایا جا رہا ہے۔ سیمنٹ کی سڑکیں بنگئی ہیں۔ راستے میں بجلی کی روشنی لگ گئی ہے۔ مگر چار مینار کو دیکھو تو ہو نظر آتا ہے وہ رونق ہی نہیں جو کسبنوں کے زمانے میں تھی اب کسی بنگلے پر "فقیری چٹکلے" کا تختہ لگا ہوا ہے تو کسی بنگلہ میں "انجمن تجہیز و تکفین" ہے ایک کونے میں کچھ اچھے سے نام کی ایک کفن کی دوکان ہے ایک صاحب نے اس کا "سیدھی سڑک"[1] نام بتایا تھا۔ معلوم نہیں نام کیا ہے مگر وہاں بھی راندہ، عبیر، کافور، کفن ملتا ہے۔ نیچے کچھ چائے خانے کچھ پھول والوں کی دکانیں ہیں اور کچھ نہیں۔ چار مینار کے کونوں پر غسال بیٹھے ہوئے نظر

---

[1] صراطِ مستقیم۔

آتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ رنڈیاں چلی تو گئیں مگر موت کو چھوڑ گئی ہیں جو چار مینار کی نگہبانی کر رہی ہے۔ اللہ اللہ کیا سے کیا ہو گیا۔"

"قوالوں کے قدرداں بھی نہیں رہے۔ صرف دو ایک چوکیاں رہ گئیں اور باقی سب مر کھپ گئے مراسنوں کا تو خاتمہ ہو گیا۔ اب صرف دو تین طائفے رہ گئے ہیں اور وہ بھی چند روز کے مہمان ہیں۔ جھانگڑنیاں تو اب نظر ہی نہیں آتیں۔ کیا کہوں۔ کیا کیا ہوا ہے۔ شہر میں مرلیوں سے بھی ایک جوبن تھا۔ مگر پولیس والوں نے اسے بھی نہ چھوڑا۔ مرلی بننا ہی سرے سے بند کر دیا۔ پرانی دھرانی جو تھیں وہ مر کھپ گئیں، انکی اولاد مرلی نہ بن سکی، ہائے میاں! کیسی کیسی مرلیاں تھیں۔ مگر اب گھس کر لگانے بھی نہیں ملتیں۔ پر انے پیر[1] کی قسم رونا آتا ہے ان باتوں کو یاد کر کے......"

"میاں یہ سب بربادی انگریزوں نے پھیلائی۔ انہوں نے مدرسے کھلائے لوگ لگے انگریزی پڑھ پڑھ کر کرستان[2] بننے۔ باوا دادا کے طریقوں کو چھوڑ کر انگریز بنگئے۔ بچوں کو انا کے بدلے ڈبے کا دودھ پلانے لگے۔ کھلائی کے بدلے آیا مقرر کرنے لگے۔ گھر میں مغلانی ہی نظر نہیں آتی۔ درزی کپڑے سی دیتا ہے گھوڑا، گاڑی، پالکی، میانہ سب چھوڑ کر موٹریں رکھ لیں۔ چلو صاحب بن گئے اس سے کتنوں کا پیٹ مارا گیا؟ بچے والی غریب عورتیں اناگیری کرتی تھیں

---

[1] غوث اعظمؓ [2] کرسچین۔

غریبوں کی بہو بیٹیاں کہلائی پن کی نوکری کرکے زندگی گذار لیتی تھیں سینا پرونا جاننے والیاں مغلانی کی نوکری کر لیتی تھیں۔ گاڑی گھوڑے پر سائیں کوچوان اور پالکی پر پیادہ اور بھوئی وغیرہ پیٹ پال لیتے تھے مگر اب تو کچھ بھی نہ رہا غریب بھوکے مرنے لگے۔ بیوائیں چکی پیس کر گذران کر لیتی تھیں اگر اب بجلی کی چکیوں[1] نے ان کے پیٹ پر بھی پاؤں دیدیا۔ بیچاریاں چکیاں چھاتی پر رکھکر بیٹھ رہیں۔ اب فاقے کر رہی ہیں۔ خدا حضور کو سلامت رکھے۔ تمام بیواؤں کو تنخواہیں کردیں۔ گذارے مقرر کردیئے جسکی وجہ روٹی کا سہارا ہوگیا۔ ورنہ بیچاریاں کب کی مرگئی ہوتیں...... آرائش بلدہ کے کام جو ہونے لگے تو غریبوں کو مزدوری مل گئی۔ مٹی ڈھوکر، پتھر پھوڑ کر کام کاج کرکے پیٹ تو پال لیتے ہیں ورنہ اسکا بھی سہارا نہ تھا۔"

جھٹکے والے کی مسلسل تقریر نے مجھے کچھ ایسا لطف دیا کہ میں لگا اونگھنے نہ جانے کتنی دیر اونگھتا رہتا۔ یکایک ایک زوردار ہچکولے نے چونکا دیا۔ دیکھتا کیا ہوں کہ ایک چھوٹی سی "روڈ اسٹن" موٹر اور جھٹکے میں تصادم واقع ہوگیا ہے خیر یہ گذری کہ موٹر کا اگلا مڈگارڈ جھٹکے کے پہئے سے ٹکرایا اور کچھ نہیں ہوا۔ موٹر جھٹکے سے چھوٹی تھی اگر کوئی بڑی بھاری کار ہوتی تو "افضل گنج" کے دواخانے کو جانا پڑتا۔ زبردستی جھٹکے والے نے "الٹا شور" کو ڈانٹنا شروع کیا

---

[1] فلور ملز۔

وہ کہے جا رہا تھا کہ تو اونگھ رہا تھا تو پینک میں تھا تو نے "سانڈ" چھوڑ دی مگر جھٹکے والے سننے تھوڑا ہی ہیں۔ وہ وہ صلواتیں سنائیں کہ سننے والوں کے کان بھی پناہ مانگنے لگے۔ بے پناہ انداز میں ایسی ایسی گالیاں دیں کہ کچھ نہ پوچھو۔

ان جھٹکے والوں کو سانڈ سے جھٹکا چلانے کی عادت ہی نہیں جب کچھو غلط چلینگے۔ سب بائیں سے چلیں تو یہ دائیں طرف چلیں گے۔ موٹر پر سب سواریاں آہستہ چلینگی۔ مگر جھٹکا نہایت تیزی کے ساتھ اسی طرح سیدھی سڑک پر سب سواریاں تیز تیز گزر جائینگی مگر جھٹکہ نہایت ہی آہستگی سے "آہستہ خرام بلکہ مخرام" کہتا ہوا گزریگا دنیا بھر کے "بان" فیل بان، شتربان، رتھ بان، شکرم بان، گاڑی بان موٹر بان (شوفر یا ڈرائیور) سب خاموشی سے اپنی سواری ہانکینگے مگر جھٹکا والا چپ ہو ہی نہیں سکتا۔ بکے جائے گا۔ اندر بیٹھی ہوئی سواریوں سے گفتگو کرے گا وہ مخاطب نہ ہوں تو گھوڑے یا گھوڑی کو جو بھی جھٹکے میں جتا ہوا یا جتی ہوئی ہوگا گالیاں دیگا۔ ننہال کے سات پشت دادہال کے چودہ پشت اور اسکی مادہ سے لیکر مالک و پرورش کنندہ تک کوستا جائے گا۔ اگر جب بھی جی نہ بھرے تو کسی نہ کسی کو ٹکر ضرور دیگا اور پھر اسے گالیاں سناتا رہیگا۔ یہ بھی ممکن نہ ہو تو گائے گا۔

"وہ لیلیٰ تھی کہ جسکو ملگیا مجنوں مقدر سے"

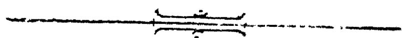
"اب سوگ میں تم کس کھولے ہوے بال آے"

سبھی سُن لیجئے۔ آواز ایسی پاٹ دار کہ سبحان اللہ! "بدک" پینے والوں میں نہ جانے کیا ہوتا ہے کہ آواز خوب "بن جاتا" ہے انہی حرکات کی وجہ جھبکا والا مشہور ہے۔ حیدرآباد میں یہ حرکات صرف اسی ہستی سے منسوب کیجاتی ہیں جو جھبکا چلاتی ہو۔ اگر کوئی اور شخص بھی ان میں سے کوئی ایسی بات کر گذرے جو خلاف طبع احباب ہو، یا انکی نظروں میں بُری ہو۔ تو اسے فوراً "جھبکا والا" کہدیا جاتا ہے۔ چنانچہ ہم نے اپنے ایک بے تکلف دوست کو تفریح کے وقت لب سڑک گانے پر "جو جھبکا والا" کہا۔ تو وہ ایسے بگڑے کہ ملنا ہی چھوڑ دیا۔

دنیا کی تمام برائیاں تمام خرافات آپ انہیں دیکھ لیجئے چھیڑ کر یہ اڑ جائنگے راستہ روک کر یہ کھڑے ہونگے، عمداً یہ ٹکر دینگے جان بوجھ کر کہ پیچھے ہی سائیکل تیز آرہی ہے یہ جھبکا روک لینگے۔ ہر شریف آدمی سے کرایہ پر تکرار کرینگے مگر ساتھ ہی ساتھ چوتھی قسم کے جھبکے والے ایسے نظر نہیں آئینگے اور سب باتیں ان میں بھی کچھ کچھ ملینگی۔ مگر ہمدرد، ملنسار کسی قدر خلیق۔ سیدھے سادے بھولے بھالے بھی ہونگے اور ایسے قابل اعتماد کہ آپ ایک دفعہ کی جان پہچان کے بعد قیمتی چیزیں جھبکے میں رکھکر گھر بھجوا دیجئے بکمال امانت گھر پر پہنچا دیں گے۔

مگر یہ کوئی بات نہیں ہر کلیہ کا مستثنیٰ ہوتا ہے بعض جھٹکے والے اچھے نکل جاتے ہیں اور بعض اچھے لوگ "جھٹکے والے" ہوتے ہیں۔ افسوس ہے کہ موٹروں کی کثرت جھٹکوں کو کم کر رہی ہے۔ آئندہ پچیس سال کے بعد شاید جھٹکہ قدیم تصویروں ہی میں نظر آئے تو آئے ورنہ اسکے باقی رہنے کے آثار تو نہیں ہیں اچھا بھی ہے۔

خس کم جہاں پاک



گھبراہٹ

زندگی یا تو امیروں ہی کی اچھی ہوتی ہے یا غریبوں کی متوسط طبقہ
ہر حال میں برا ہر طرح غریب کی مرن ہر حال میں خرابی۔ امراء موٹر نشین ہیں
بگھی نشین ہیں ہر طرح کی سہولت ہے۔ غربا پیدل ٹاپتے پھرتے ہیں۔ انہیں
کوئی عار نہیں کوئی ان پر انگلی نہیں اٹھاتا۔ مگر خرابی بیچارے متوسط الحال
یا (مفلوک الحال) لوگوں کی ہے۔

سیّد اٹھے جو گزٹ لیکے تو لاکھوں لائے
شیخ قرآن دکھاتے پھرے پیسہ نہ ملا

خیر وہ تو سر سیّد تھے جن کے گزٹ پر لاکھوں مل گئے مگر انہیں کے
لوگ (اولادِ معنوی) نیم سرکاری مراسلہ لیکر نکلتے ہیں تو کروڑہا روپیہ ملجاتا ہے
اور ہم ہیں کہ پڑے ٹانگیں رگڑ رہے ہیں۔ اور کس نمی پرسد کہ بھیا کون ہو؟
بنا تردد اور اوقات کی پابندی میں سختی۔ غیر حاضری اور دیر حاضری

کا ڈر۔ بایں ہمہ پیدل ٹہلنے کے عوض قرض وام کرکے ایک ٹوٹی پھوٹی
سائیکل لے لی تو غضب ہوگیا۔ غلط راستہ (رانگ سائڈ) چلو تو وہیں ایک
پولیس کے جواں نے ڈانٹ بتائی اور واپس کردیا۔ قندیل ذرا دیر کیلئے
روشن نہ ہو یا ہو اسے بجھ جائے تو بس دھر لئے گئے یا تو تھانہ میں شب بسری
کرکے صبح صدر امین کو توالی کی منت خوشامد کیجئے یا سیکل کو عوض روبرو
رکھوا کر ٹھنڈے ٹھنڈے پیدل گھر کو سدھارئیے اور دوسرے روز رحقیت
اتفاقی لیکر امیں کچہری اور عدالت کے چکر کاٹئے پھر جرمانہ ادا کرکے ہائی پائیے

چاہے آپ کے کپڑے سفید ہوں یا میلے اچھے ہوں یا برے مگر
چھڑ کاؤ کے موٹر کے گذرنے کے وقت سائیکل سے اتر کر کونے میں
دبک رہیے ورنہ نصف آخر یعنے ایڑی سے کمر تک کا حصہ جسم تر بتر نظر
آئے گا چھڑ کاؤ کی موٹر کا شوفر آپ کو سائیکل سوار سفید کپڑے پہنے ہوئے
دیکھکر بکمال لطف مہربانی ذرا آہستہ بھی چلائے گا۔ اور آپکے قریب سے
لیجائے گا۔ اور پانی بھی اسوقت خوب اچھلتا نظر آئے گا مختصر یہ کہ آپ
بھیگی بلی بنے ہوئے گھر تشریف لیجائیں گے۔

بارش ہو چکی ہو سڑکوں پر کیچڑ ہو اور بعض بعض گڑھے
پانی سے بھرے ہوئے ہوں آپ سفید پوشی کے ساتھ سائیکل پر بیٹھے ہو
ہوں تو ہر موٹر چلانے والا چاہے وہ ذاتی موٹر کا مالک ہو یا کسی کا شوفر یا

ٹکسی کا ڈرائیور کوئی ہو موٹر کو آپ کے قریب سے اور اس قدر قریب سے تیز بلکہ تیز تر اسطرح لیجائے گا کہ آپ سر سے پاؤں تک کیچڑ زدہ نظر آئیں گے نہ صرف ٹوپی بلکہ عینک ناک مونچھ اور شیروانی۔ پائجامہ جوتے تک چھینٹوں سے پُر نظر آئیں گے۔

آوارہ گرد لونڈے، ہشتین۔ ریٹائرڈ بوڑھے پچپن سالہ عورتیں یہ سب آپ کو بیچ سڑک پر سے چلتے ہوئے ملیں گے۔ آپ گھنٹی بجائیں چیخیں چلائیں ڈانٹ ڈپٹ کریں مگر کچھ اثر نہ ہوگا۔ وہ یقیناً آپکی سیکل سے ایک اول کے ساتھ ہم آغوشی کیلئے تیار رہیں گے۔ اگر آپ کی سیکل کے پہیئے نے یا ہانڈل نے ذرا بھی چھوا تو بس غضب ہو گیا۔ چیخ پکار شروع ہو گئی۔ کوئی اس پیدل سے نہ پوچھیگا کہ تو بیچ میں کیوں آیا گھنٹی کی آواز سنکر ہٹا کیوں نہیں۔ بس آپ سے اور صرف آپ سے سوالات ہونگے اور آپ پولیس میں جائینگے۔ اسوقت نہ تو سائڈ پوچھی جائیگی اور نہ گھنٹی کا سوال ہوگا۔

کسی کی سواری آنیوالی ہو تو سب سے پہلے سیکل سوار روکے جائیں گے۔ چاہے وہ آنیوالا بنگال کا گورنر ہو یا مدراس کا میسور کا وزیر اعظم ہو یا ہندوستان کا چرخہ بردار (گاندھی) مگر آپ سب سے پہلے سیکل سے اتارے اور روک لئے جائیں گے۔ موٹر نشین جھم جھم جائیں گے۔ موٹر سیکل سوار ڈنکے کی چوٹ پھر ینگے۔ بگی نشین بیچ کھیت گزریں گے ایک آدھ پیدل بھی چلے جا یگا مگر آپ محض

اس علت میں کہ سیکل سوار ہیں روک دیئے جائینگے۔

اگر کسی سڑک پر نالی بنائی جا رہی ہو یا آدھی سڑک زیر تعمیر ہو تو ایکطرف لکڑیاں لگا کر آدھا راستہ روک لیا جائیگا۔ سرخ کپڑا بھی بعض وقت لگایا جائیگا ایک دو دفعہ سرخ قندیل بھی نظر آئے گی۔ مگر ایک پولیس کا جوان تقریباً دن بھر میں (۸) گھنٹے ضرور کھڑا ہو راستہ چلنے والوں کو ستائے گا۔ چھکڑا گذر جائے بنڈی آ جائے۔ موٹر چلی جائے۔ موٹر سیکل گذر جائے۔ بگھی پار ہو جائے۔ پیدل گذرتے رہیں مگر آپ نے قدم رکھنے کا ارادہ کیا کہ اس نے بکمال "اڈوائزیت" ہاتھ بتا کر آپ کو روک دیا اور لگا منہ ہی منہ میں بڑبڑا کر ڈانٹنے "حضرت اتر کر جائے گڑ بڑ زیادہ ہے" چلو چھٹی ہوئی ہاتھ میں سیکل پکڑے ٹاپ رہے ہیں۔

افضل گنج کی مسجد[1] سے سدی عنبر کے بازار کی طرف جانے کا ارادہ ہو تو پہلے چار آنے کے پیسے پنکچر جڑوانے کیلئے جیب میں رکھ لیجئے۔ ادھر آپ نے قدم رکھا ادھر کیلا چبھا ہوا اندر۔ اب آپ سیکل ہاتھ میں پکڑے ڈھونڈ رہے ہیں دکان سیکل ساز کی۔ لوہاروں کی دکانیں۔ لوہے کے پرانے سامان کی دکانیں دونوں طرف تھیں مگر اب صرف ایک طرف ہیں۔ راستہ کیلوں سے بھرا ہوا ملے گا نہ تو یہاں کبھی جھاڑو ہوتی ہے نہ ہونے کا امکان ہی اور نہ ہوگی

---

[1] اب یہ سڑک درست ہو رہی ہے۔ خدا کرے جلد مکمل ہو۔

اور نہ جھاڑو سے ان کیلیوں کا سدِ باب ہو گا۔ اور نہ تو آپ حفاظت کے ساتھ اس راستہ سے گذرے ہیں نہ گزرینگے۔

ڈرینج کی نالیوں کے کیلئے جا بجا گلیوں میں سڑکوں پر گڑھے کھدے ہوئے ہیں۔ مگر نہ تو کسی جگہ سُرخ قندیل ہی نظر آئے گی اور نہ محفوظ باڑھ ہی آپکی سیکل ہید یا معمولی ڈنٹھل کی باڑ سے ٹکرائے تو آپ اطمینان سے گڑھے میں جا رہیں گے۔ آپ کا سر پھوٹے دانت ٹوٹیں ہڈی پسلی گولہ ہو جائے سر رشتہ ڈرینج کی جوتی سے اسے تو کام ہے نالیوں کے بنانے سے۔ اجی حضرت انہیں نالیوں پر آپ کی حفظانِ صحت کا دارومدار ہے جب نالیاں بن جائینگی تو پلیگ آئے گا اور نہ ملیریا اب رہا آپ کا سر پھوٹنا دانت ٹوٹنا یہ سوال ہی فضول ہے۔ میاں دانت اور سر اور ہڈی پسلی جان سے پیاری ہے ٹوٹی ٹوٹی لاحول بھیجو اجی جان بچی لاکھوں پائے!

آذر[1] کے ابتدائی ہفتہ میں کم از کم چار روز کی رخصت اتفاقی لیکر صفائی بلدہ کے دفتر کو جایا کیجئے پہلے روز آپ کو صیغہ ٹکس خالی ملے گا۔ دوسرے روز اس قدر بھیڑ رہے گی کہ آپ تین گھنٹے انتظار کرکے لوٹ آئیں گے تیسرے روز آپ کو ٹکس کے منشی صاحب ہدایت کرینگے کہ حضت پرانا پلیٹ لائیے نمبر مکان بتلائیے۔ سمت حلقہ بھی لکھدیجئے چوتھے روز آپ ہر طرح کی لیس ہو کر جائیں تو صبح نو بجے سے شام کے پانچ بجے تک ٹہرنے کے بعد ایک

[1] سنہ فصلی کا پہلا مہینہ ۱۲

پلیٹ نمبر کا ملے گا۔ اور وہ بھی مفت نہیں ایک روپیہ آٹھ پیسے دینے کے بعد جس کو آپ جھٹکہ کے نمبر کی طرح سیکل کے پیئے میں کاڑیوں سے لگا دینگے چیٹھی یعنے رسید موڑ توڑ کر جھٹکے والے کی طرح جیب میں رکھ لیں گے اور گھر جائیں گے کہ کچھ ہو نمبر تو لے لیا اب سال بھر کی بے فکری نمبر اور چیٹھی دونوں کے پاس ہو گی۔ صرف آپ میں اور جھٹکہ والے میں ایک "تلے" کا فرق ہو گا، دفتر میں یا تو اپنے صیغہ میں گاڑی لیجائیے یا باہر رکھ دیجئے کبھی آپ کا قفل چوری جائے گا۔ کبھی قندیل جاتی رہے گی۔ کبھی کوئی نیک بندہ ازراہِ تفریح سوئی چبھو کر پنکچر کر دے گا۔ اگر سیکل عمدہ اور قیمتی ہے تو کوئی نہ کوئی لیکر چلتا بنے گا۔ آپ درخواست دیں گے۔ آپکے افسر اعلیٰ ایک نیم سرکاری کوتوالی بلدہ کو بھی لکھدیں گے۔ مگر فضول نہ تو سیکل واپس ملی ہے نہ ملے گی۔ آپ روئیں گے دھوئیں گے اور خاموش ہو رہینگے۔

یہ ہیں برکتیں سیکل سواری کی اور یہ آفتیں نازل ہوتی ہیں سیکل سوار پر

ہر بلائے کز آسماں آید — گرچہ بردیگراں قضا باشد

بر زمیں تا رسیدہ می پرسد — "کہ بیہاں سیکلاں" کجا باشد

اگر اس پر بھی آپ نے سیکل پر سواری کی تو آفریں ہے آپ کی ہمت پر اچھا ہے مزے کیجئے کسی نے کہا ہے نا ع۔ بے حیا باش و بادشاہی کن!

نوٹ:۔ اب ڈسک دیئے جارہے ہیں جن کی قیمت عہ لیجاتی ہے

خواہ مخواہ

دنیا میں اگر کوئی طبقہ خطرناک ور تکلیف دہ ہی تو یہی ہے ایک شریف آدمی کیلئے اس طبقہ کی موجودگی اسی قدر خطرناک ہے۔ جسقدر نمونیہ کے مریض کیلئے سردی۔ لطف یہ ہے کہ دنیا کے ہر حصہ میں اس طبقہ کے افراد بھرے پڑے ہیں۔ اور ممالک میں کم ہیں مگر اسلامی ممالک میں کثرت سے اور خصوصاً ہندوستان انھیں سے بھرا پڑا ہے۔

چاہے آپ ریل میں سفر کر رہے ہوں۔ یا راستہ سے پیدل گذر رہے ہوں۔ دفتر میں بیٹھے ہوں یا کسی رسٹوران میں چائے پی رہے ہوں۔ یا دیوانخانے میں بیٹھے لکھ رہے ہوں۔ کسی وحشتناک اور خاموش سڑک پر چل رہے ہوں۔ کوئی نہ کوئی خواہ مخواہ ضرور مل جائے گا۔ ریلوے سفر میں بدنصیبی سے تھرڈ کلاس کی آفت نازل ہو جائے تو سارا ڈبہ آپکو خواہ مخواہوں سے بھرا ملیگا۔ ایک آپ کا نام پوچھے گا۔ ایک مقصد سفر دریافت کرے گا۔

ایک آپکے واٹر باٹل میں سے پانی نکال کر پینے لگے گا۔ ایک بلا تکلف پان اور سگریٹ مانگ لیگا۔ اگر کہیں آپ نے اس بے تکلفی کو بڑھنے دیا اور پھر ہونے لگی ناشتے یا کھانا کھانے کی تیاری اور تکمیل ضابطہ (صفت کرم داشتن) کیلئے آپ نے انہیں دعوت دیدی تو پھر یہ ٹوٹ پڑے چاہے آپکے پاس بڑا ٹفن باسکٹ ہو یا الومنیم کا توشہ دان، بہرحال سبھی خالی — اور آپ مقام مقصود پر بھوکے پہنچیں گے۔

بدنصیبی سے کہیں ہمیشہ بلکہ روزانہ دو چار خواہ مخواہ مل جاتے ہیں لاکھ جتن کئے ہزار احتیاط کیا مگر کچھ نہ ہوا۔ تھرڈ کلاس میں سفر کرنا ہم نے اسی وجہ سے چھوڑ دیا کہ ہمارا توشہ ان لوگوں کی نذر ہو جاتا تھا۔ ہاتھ میں اخبار یا کتاب ہو تو چھن جاتی تھی۔ پانوں کی ڈبیہ اور سگرٹ کا ڈبہ خالی ہو جاتا تھا اور سب پر طرہ یہ کہ دماغی اور روحانی کوفت اس قدر کہ ہم دو چار روز کیلئے مضمون لکھنے کے قابل نہیں رہتے تھے۔

ایک دفعہ ہم حیدرآباد سے عثمان آباد جا رہے تھے کہ ایک خواہ مخواہ نے بیگم پیٹ اسٹیشن سے گفتگو کا سلسلہ شروع کیا تو واڑی جنکشن تک چین لینے نہیں دیا۔ واڑی پر ہم نے ٹکٹ بدل لیا اور سکنڈ کلاس میں جا کر بیٹھ رہے۔ تب کہیں اطمینان نصیب ہوا۔ اگر تھرڈ کلاس میں دوست احباب کے ساتھ سفر کیا جائے اور پانچ سات آدمی ایک جگہ بیٹھکر

ہنسنے کھیلنے لگیں تو ان لوگوں سے چھٹکارا ہو سکتا ہے ورنہ نہیں۔

بعض دفعہ سیکنڈ کلاس بھی انہیں حضرات سے بھرا ہوا نظر آتا ہے ایک زمانہ میں ہم پونہ میں تھے اور مقامی لباس کے استعمال کا شوق تھا چنانچہ جب ہم نے پونہ کو خیرباد کہا اور حیدر آباد کا قصد کیا تو اسی مرہٹہ لباس میں اسٹیشن پہنچ گئے۔ بعض ہندو احباب بھی ہمیں خدا حافظ کہنے کیلئے اسٹیشن پر آ گئے تھے۔ رات کا وقت اور گرمی کا موسم تھا ہم نے سیکنڈ کلاس کا ٹکٹ لے لیا اور سوار ہو گئے۔ احباب نے خدا حافظ کہا ٹرین چلنے لگی۔ ایک الفربہ خواہ مخواہ قسم مرد مسلمان بیٹھے ہوئے ہمیں دیکھ رہے تھے ٹرین کے چلنے کے بعد ہمنے ایک سیٹ پر بیٹھکر اپنا بستر کھولنا چاہا تھا کہ آپ مخاطب ہو گئے فرمانے لگے۔ کہاں جائینگے راجہ! ہم نے کہا "جناب ہم مفلس ہندوستان کے ایک قلاش مزدور ہیں راجہ نہیں" فرمایا "نہیں مہاراج ہم نے تعظیماً آپکو راجہ کہا تھا" ہم نے کہا "حضور جب تو آپ نے راجہ سے مہاراجہ کر دیا۔ بھلا ہندوستانی غلاموں کیلئے یہ طریقہ تخاطب کچھ ٹھیک ہے" فرمانے لگے۔ راؤ صاحب "ہم نے بات کاٹ کر کہا" جناب راؤ صاحب کا خطاب ہمیں ابتک نہیں ملا اور نہ مل سکتا ہے" بات بڑھنے لگی دو ڈھائی گھنٹے اسی ردو قدح میں گذرے۔ بالآخر مولوی صاحب تھک کر سو رہے ہمنے بھی اپنا بستر جما لیا۔ صبح آنکھ کھلی تو مولوی صاحب میٹھی نیند سو رہے تھے

ہم نے لباس بدل لیا اور جانماز بچھا کر فریضۂ فجر ادا کرنا شروع کیا۔ چونکہ بدنصیبی سے ہم نے ایک مولوی کے گھر میں جنم لیا ہے اور بچپن سے خاندان بھر کو نماز پڑھتے دیکھا ہے اسی لئے ہمیں بھی نماز کی عادت ہو گئی ہے اور ہم بالجہر اقامت کہنے کے عادی ہو گئے ہیں۔ شاید ہماری اقامت گوئی پر مولوی جی جاگ پڑے اور لگے حیرت و استعجاب سے دیکھنے جب ہم نے نماز ختم کی اور سگرٹ جلا کر پینا شروع کیا تو آپ نے دریافت فرمایا کیا آپ نومسلم ہیں۔ کہئیے ہم کیا جواب دیتے۔ عرض کیا ہمارے سات کیا بلکہ چودہ پشت میں بھی کسی نے اسلام قبول نہیں کیا۔ صرف ہمارے جداعلیٰ حضرت علی علیہ السلام نے البتہ نومسلم ہونے کا امتیاز حاصل کیا تھا۔ ان کے بعد سے ہر بیٹا اپنے باپ کے مذہب پر قائم ہے کسی نے دوسرا مذہب قبول نہیں کیا۔ فرمانے لگے ماشاءاللہ آپ سید ہیں۔ اس کے بعد سے مولوی صاحب نے بس ہمیں صیغۂ استفسار بنا ڈالا۔ آپ کا نام، آپ کے والد کا نام، آپ کا وطن، پیشہ، عمر، لیاقت خاندان سکونت سبھی کچھ پوچھ لیا۔ ہم نے یہی مناسب سمجھا کہ کرڈووارڈی پر ڈبہ بدل لیجائے ورنہ حیدر آباد پہنچنے تک حضرت چین نہ لینے دیتے، ایسے حادثے ہم پر ایک دو نہیں بلکہ سینکڑوں گذر چکے ہیں۔ صبح کے دفاتر میں گھر سے نکلنے میں دیری ہو گئی ہے۔ آپ نہایت تیزی سے بھاگ رہے ہیں کہ دیر حاضری نہ ہو جائے۔ مگر راستہ میں ایک نہ ایک خواہ مخواہ ضرور مل جائیگا

پھر کیا ہے! السلام علیکم، مزاج شریف، مولنا ذرا توقف فرمائیے۔ ارے آپ
اتنی صبح جلدی جلدی کہاں جا رہے ہیں۔ خیر تو ہے۔ اچھا تو گویا صبح کے
دفاتر ہیں۔ آپ سے تو اب ملاقات ہی نہیں ہوتی پہلے تو کبھی کبھار مل بھی
لیتے تھے۔ اچھا یہ تو فرمائیے کہ سبع معلقہ کا سب سے اچھا ترجمہ کس نے کیا ہے
مجھے شدید ضرورت ہے کہاں سے ملے گا۔ آپ کے پاس کوئی نسخہ ہے کیا؟
انہی باتوں میں پندرہ منٹ لگ گئے۔ آپ ان سے پیچھا چھڑا کر دفتر پہنچتے
ہیں تو آدھ گھنٹہ لیٹ!

چاہے آپ بغیر ناشتہ کئے دفتر گئے ہوں۔ اور دوپہر میں بھی کچھ کھایا
نہ ہو۔ چار بجتے ہی بکمال گرسنگی گھر کی طرف دوڑے جا رہے ہوں۔ اس سے
بحث نہیں کہ آپ کا چہرہ اترا ہوا ہے منہ پر ہوائیاں اڑ رہی ہیں پریشان
جا رہے ہیں۔ خواہ مخواہ روک ہی تو لے گا۔ ارے بھائی ہاں تمکین صاحب
کدھر یار۔ ایک میوزک کلب نامپلی میں قائم ہوا ہے۔ ہر جمعرات کو اہل
فن جمع ہوتے ہیں۔ ہر شخص اپنے اپنے کمال کا اظہار کرتا ہے اب کی جمعرات
کو تم بھی آ جاؤ اس کے ممبر بن جاؤ۔ خوب دلگی رہے گی۔ مولوی عبدالوہاب
بھی آتے ہیں۔ ہمیشہ تمہاری تعریف کرتے ہیں۔ بھئی وہ بھی خوب آدمی
ہیں۔ گانے کا مذاق بھی اچھا ہے۔ یہاں بھوک سے جان نکل رہی ہے
اور خواہ مخواہ ہیں کہ گانے میں محو ہیں۔ پھر ان لوگوں سے کس طرح پیچھا چھڑائیے؟

چاہے آپ کسی سے ملنے کیلئے وقت مقرر کر چکے ہوں اور پندرہ منٹ پہلے گھر سے نکل رہے ہوں۔ کپڑے پہنے ہوئے دیوانخانے کے دروازے میں ہی کیوں نہ ہوں۔ کوئی خواہ مخواہ گھیرے گا۔ ایں آپ کہیں جا رہے ہیں کیا واہ آپ آمدیتم برخاست یہ بھی کوئی بات ہے۔ طاقت مہماں نہ داشت خانہ بہ مہماں گذاشت، یار بیٹھو تو سہی اب تو تم ملتے ہی نہیں۔ پرسوں حمایت ساگر چلنے کا خیال ہے تم بھی چلونا! دو تین دن رہ کر آجائیں گے ہم نے ستار کا انتظام کیا ہے۔ لاکھ کہئے کہ حضرت ہمیں کام ہے۔ ایک جگہ جانا ہے چائے کی دعوت ہے اور لوگ منتظر ہونگے مگر کون سنتا ہے انتہا یہ کہ وہ اتنی دیر تک بک بک کریں گے کہ آپ کا وقت گذر جائے گا اور لوگ آپ کا انتظار کر کے چائے پی لیں گے۔ دوسرے روز آپ کو جا کر معافی مانگنی پڑے گی آپ دنیا کے جھگڑوں سے اکتا کر تھا وقت گذارنے کیلئے سنیما چلے جائے۔ وہاں بھی کئی ایک ملاقاتی بیسیوں دوست مل جائیں گے سب سے پیچھا چھڑا کر کسی کونے میں بیٹھ جائے برابر والی سیٹ سے کوئی نہ کوئی ضرور مخاطب ہو جائے گا۔ افوہ بڑا لمبا کھیل ہے یا ڈرالی پلانٹ بھی غضب کے تی ہی۔ یا آپ نے بن ہر ملاحظہ کیا تھا، کہہ کر آپ سے کوئی نہ کوئی جواب سن لیگا اکیدفعہ آپ نے جواب دیا اور اس نے بے تکان سلسلۂ گفتگو جاری کر دیا پھر خیر نہیں۔ یا تو سیٹ بدل ڈالئے یا درجہ بدل دیجئے۔ ورنہ ٹھنڈے

ٹھنڈے تشریف لیجائیے۔

یہ خواہ مخواہ بعض دفعہ آرام دِہ بھی ثابت ہوتے ہیں چنانچہ ہمیں بعض
بعض خواہ مخواہوں سے بڑا آرام ملا اور فائدہ پہنچا ایک دفعہ سفر میں ایک
خواہ مخواہ نے دو گھنٹہ تک مختلف سوال کر کر کے دماغ خراب کر دیا۔ مگر جب ہم
منزلِ مقصود پر پہنچے تو انہوں نے نہ صرف ہمیں اس جگہ کے متعلق ضروری معلومات
ہی بہم پہنچائے بلکہ پندرہ روز تک اپنے گھر پر مہمان رکھا۔ روزانہ ناٹک اور
سینما دکھانے کے علاوہ اپنے نوجوان صاحبزادے کو ہماری رہبری کیلئے
وقف کر دیا۔ چنانچہ اُن خواہ مخواہ اور اُن کے لڑکے کی وجہ ہم نے اس جگہ کے
تمدنی اور معاشی حالات اس قدر معلوم کر لیے کہ اگر کسی دوسری جگہ دو سال
بھی قیام کرتے تو اسکے عشر عشیر معلومات بھی حاصل نہ ہوتے وہیں ایک نوجوان
ہندو خاتون نے خواہ مخواہ ہم کو ایک ہندو مدرسہ کا معائنہ کرانے کے
علاوہ ۴-۵ مرتبہ چائے پر دعوت دیدی اور دل میں بین الاقوامی شادی
کی ہوس بھی پیدا کر دی مگر خدا بھلا کرے ان خواہ مخواہ بزرگوار کا انہوں
نے اپنے بعض تلخ تجربے سنا کر ہمیں باز رکھا۔ ورنہ معلوم نہیں ہمارے سر پر
کتنے چرخے ٹوٹتے اور کتنی گاندھی ٹوپیاں خون میں تر بتر ہوتیں۔ ولے
بخیر گذشت۔

ایک دفعہ کسی مذہبی معاملہ پر بحث کرتے ہوئے والد مرحوم نے جب

خوب ڈانٹ ڈپٹ کی وہ نرے مولویانہ خیالات کے پکے سُنّی المذہب
بزرگ تھے اور ہم مذہب سے بہت دور مائل بہ دہریت اسلئے ان سے مذہبی
حد تک ہمیشہ اختلاف رہتا تھا۔ تعلقہ تلجا پور پر وہ تحصیلدار تھے ہم بھی انکے
ساتھ ہی تھے۔ تلجا پور میں تلجا بھوانی کا مشہور مندر ہے۔ وہاں دیول پر
کروڑوں جاتریوں کا مجمع ہوتا تھا اور "کھنڈ اشنان" قابل دید تھا۔ چھوٹے
سے حوض میں جس کا پانی متعفن ہو چکا تھا حسینان جہاں غوطے لگا کر آبرو
بڑھاتی تھیں۔ ہمارا مشغلہ ہی یہ تھا کہ اشنان کا نظارہ کیا کرتے تھے ایکدفعہ
ہم نے والد مرحوم کو بھی دعوت نظارہ دی۔ حضرت نے کھنڈ اشنان
دیکھا اور خوب دیکھا۔ جاترا کے دن تھے۔ دور دور سے آئی ہوئیں غارت
گرانِ صبر و ہوش و نازنینان تقویٰ شکن ہلکی سی ململ کی دھوتی سے حصہ اسفل
و اعلیٰ کو چھپائے شرماتے لجاتے مسکراتے ہوئے آ آ کر اشنان کرتیں اور بھیگے
ہوئے بالوں سے دُرِ خوش آب ٹپکاتے ہوئے ایک باریک سی اوڑھنی کو
تمام جسم سے لپٹ کر جب نکلتیں تو یہ معلوم بھی نہ ہوتا تھا کہ کوئی کپڑا جسم کو
چھپائے ہوئے ہے یا نہیں۔ حضرت نے اس تماشے کو دیکھا اور خوب
دیکھا۔ دن بھر اس پر کوئی رائے کا اظہار نہیں فرمایا رات کو کھانے پر آپ نے
منجملہ اور برائیوں کے ہندوؤں کی یہ برائی بھی گنائی کہ اس بے حیائی
اور بے باکی سے تقریباً برہنہ ہو کر اشنان کرتی ہیں اور خواہ مخواہ لوگوں کے

مائل بہ شہوت کرتی ہیں۔ ہم نے صرف قبلہ کے چھیڑنے کیلئے کہا پیر و مرشد سنا ہے کہ ہجنوں (ہجانیوں) کی حالت بھی تو یہی ہوتی ہے۔ ایک ہی کپڑا لپیٹے وہ بھی یوں ہی غارت کرتی پھرتی ہیں۔ بس غضب ہو گیا بڑے میاں نے کھانا چھوڑ کر گالیاں دینی شروع کیں اور رات کے بارہ بجے تک گالیاں سناتے رہے ہم نے اس ناگوار سلسلۂ گالی گلوچ کو ختم کرنے کے لئے یہی مناسب سمجھا کہ چند روز کیلئے ان کے سامنے سے ہٹ جائیں۔ چنانچہ دوسرے ہی روز شولاپور پہنچ گئے اور وہاں سے عادل شاہیوں کے اجڑے ہوئے پایہ تخت بیجاپور جا ٹھہرے۔ ڈاک بنگلہ میں کچھ لوگ ایسے بھی تھے جو شمالی ہند کے متوطن اور امبا بائی (تلجا بھوانی) کے درشن کو آئے تھے اور درشن سے فارغ ہو کر بیجاپور دیکھنے آ گئے تھے چونکہ ان لوگوں نے ہم کو تلجا ماتا کے مندر میں بے تکلفی سے چلتے پھرتے اٹھتے بیٹھتے دیکھ لیا تھا اس لئے بیجاپور میں بلا کسی تعارف کے ہم سے گفتگو شروع کر دی اور خواہ مخواہ دوستی ہو گئی ایک خاتون نے جو آثار قدیمہ سے بھی کسی قدر دلچسپی رکھتی تھیں ایک چھوٹے بھائی اور ایک بوڑھی خادمہ کو ساتھ لیکر سفر کر رہی تھیں ہمیں اپنا گائڈ بنانے کی خواہش کی ہم نے بھی کمال ہمدردی اس سعادت کیلئے آمادگی ظاہر کی اور دوسرے روز سے تاریخی مقامات کا معائنہ شروع ہوا گول گنبد یا بولی گنبد سے لیکر جہاز محل اور ملک میدان توپ تک کا معائنہ

ہم نے کرادیا۔ تصویریں لیں۔ اسٹال سے خریدی ہوئی گائیڈ کے اندراجات کی
غلطیاں نکالیں۔ اُس کی صحت کی اور بیجاپور سے گلبرگہ کا رخ کیا اس زمانہ
میں ہمارے وہ ایک عزیز گلبرگہ میں ضرور تھے مگر ہم لوگوں نے ڈاک بنگلہ ہی
میں قیام کیا۔ اور دو روز تک قلعہ ہفت گنبد رکن الدین تولہ اور تالاب
بھوسگا دیکھکر ہم لوگ حیدرآباد پہنچ گئے یہاں کی مصروفیتیں اتنی دلچسپ
رہیں کہ

آپ سنئے گا تو شرمائے گا

بہر حال ہم نے خواہ مخواہ بن کر دو ڈھائی مہینے ان کے ساتھ بسر کئے اور
پھر انہیں گھر تک پہنچا کر اطمینان کا سانس لیا۔ اب بھی دعا ہے کہ کوئی
ایسا خواہ مخواہ مل جائے۔

ہمارے دفتر میں ایک صاحب بڑے خواہ مخواہ واقع ہوئے ہیں
جہاں دو آدمیوں نے گفتگو شروع کی کہ آپ جا پہنچے اور دخل در معقولات
شروع کیا۔ چاہے آپ اپنی گھر والیوں کے متعلق گفتگو کر رہے ہوں یا کسی
علمی ادبی مباحثے میں مصروف ہوں یا کسی "جو قومی میچ" پر خیال آرائی کر
رہے ہوں۔ وہ برابر آپ کی گفتگو میں حصہ لیتے رہینگے۔ جدید خیالات کی
انہیں ہوا بھی نہیں لگی ہے۔ نئی دنیا سے وہ بالکل بے خبر ہیں پچپن سالہ
عمر کو پہنچ چکے ہیں مگر "خواہ مخواہیت" کو کیا کریں گے۔ ہم نے ان کا نام

خدائی فوجدار" رکھا ہے۔ وہ سنکر کبھی بگڑتے اور کبھی خوش ہوتے ہیں مگر "العادة طبیعة الثانیہ" کریں گے کیا مجبور ہیں۔

ہم نے بعض ایسے خواہ مخواہ بھی دیکھے ہیں جو غیور، خود دار، تنک مزاج سبھی کچھ ہوتے ہیں اور "اپنی خواہ مخواہیوں" کی وجہ سے بے طرح ذلت اٹھاتے ہیں۔ کئی کئی روز اسی کوفت میں رہتے ہیں مگر خواہ مخواہی انہیں چھوڑتے۔ ایک ہمارے دوست جو پولیس کے سرکل انسپکٹر ہیں ایکدفعہ اپنے مہتمم پولیس کے بنگلہ پر پہنچے۔ دورے سے واپس آئے تھے۔ مہتمم صاحب کا مزاج پوچھا۔ زنانہ سے ملازم لڑکا پان لایا۔ تو آپ نے اُسے روک کر فرمایا دیکھنا بیگم صاحبہ کو میری طرف سے آداب تسلیمات کہنا اور مزاج پوچھنا مہتمم صاحب تھے قدیم وضع کے بزرگ، انہیں اتنا غصہ آیا کہ چہرہ سرخ ہوگیا۔ بگڑ کر فرمانے لگے۔ سرکل صاحب! آپ مجھ سے دفتری تعلقات ہیں۔ میری بیوی سے آپ کا کیا تعلق؟ آپ اسے سلام کہلوانے والے کون آئندہ سے میرے مکان کی حد تک آپ ایسی حرکت نہ کیجئے ورنہ آپ کو نقصان ہوگا۔ غریب سرکل انسپکٹر کانپ اٹھا دو روز تک اسی کوفت میں رہا۔ مدت تک کسی کے گھر کی مزاج پرسی نہیں کی مگر آخر عادت تھی، چھوٹتے چھوٹتے ہی آہستہ آہستہ پھر عافیت پوچھنے لگے۔

ان لوگوں سے بڑی تکلیف ہوتی ہے جو صورت دیکھتے ہی مخاطب

ہو جاتے ہیں اور خاندان بھر کے حالات پوچھنے کے علاوہ بعض ایسی خانگی چیزیں پوچھنے لگتے ہیں جو ظاہر نہیں کیجا سکتیں اور ایسے سوالات کر کے خود ہی پریشان ہوتے ہیں۔

تہذیب جدید نے اسکو بری نگاہوں سے دیکھا ہے تہذیب قدیم بھی اسے جائز نہیں رکھتی۔ مگر بوڑھوں کو کیا کیا جائے اُسے اچھا سمجھتے ہیں۔ ہمیں ایک دوست کے گھر جانے کا اتفاق ہوا۔ بدقسمتی سے ان کے جد بزرگوار تشریف رکھتے تھے ہمارے دوست نے اِن سے ہمارا تعارف کرا دیا۔ بس غضب ہو گیا آپ کے والد کا نام کیا کرتے تھے آپ کے دادا کا نام، کس خاندان سے ہیں مکان کہاں ہے پیدا کہاں ہوئے۔ تعلیم کہاں پائی نوکر کہاں ہیں۔ شادی ہو چکی۔ کب ہوئی کس گھر ہوئی۔ بچے ہیں۔ کتنے ہیں۔ پیدا ہی نہیں ہوئے یا ہو کر جاتے رہے (مر گئے) ڈاکٹر راماہندجی کا پرچہ سوالات متعلق امراضِ مردان و زناں تقریباً ایسے ہی سو سوا سو سوالات پر مشتمل ہوتا ہے۔ جو بڑے میاں نے ہم سے فرمائے کہئے اسوقت ہم کیا کرتے۔ اگر صحیح صحیح جواب دیں تو سوالات میں اور وسعت پیدا ہو۔ اگر جواب نہ دیں تو بڑے میاں بگڑیں کہ کیسا بدتہذیب ہے فقط

شادی سے پہلے

بچپن میں ہمیں شادی کی بڑی خواہش تھی اور یہ خواہش ہر چھوٹے لڑکے کو ہوتی ہے۔ کسی معصوم سے پوچھیے کہ "میاں شادی کروگے" ؟ تو وہ جواب دیگا "کروں گا" "کس سے" تو کہدے گا "اماں سے" چلو چھٹی ہوئی جہاں تک ہمیں یاد ہے ہم نے کبھی ایسی خواہش تو نہیں کی البتہ ایک عزیز لڑکی جو رشتے میں ہماری بہن تھی اور ہم سے دو ایک سال بڑی بھی تھی ہمارے پیش نظر ضرور تھی۔ جہاں کسی نے پوچھا کہ میاں شادی کروگے تو ہم نے کہدیا کہ ہاں کریں گے۔ پوچھا کس سے تو کہدیا "بی بی" سے (یہ لڑکی کا نام تھا) بچپن کی آخری منزلیں طے ہوئے تک ہم یہی چاہتے رہے کہ ہماری شادی بی بی سے کردی جائے۔ خیر جوانی کی ابتدائی سیڑھیاں ہم نے طے کرنی شروع کی تھیں کہ بی بی کی شادی ہوگئی ہمیں اس سے سخت رنج ہوا۔ دولہا کو ہم نے طرح طرح کی

اذیتیں دیں مختلف پہلوؤں سے ستایا۔ چنانچہ "چوتھی" کے روز ایسی
خبر لی کہ دولہا میاں کا منہ کئی جگہ سے زخمی ہوگیا۔ خون بہنے لگا۔ وہ سمجھتے
رہے کہ "سالا" مذاق کر رہا ہے اور ہم نے سوچا کہ بدلہ یوں ہی لینا چاہئے
خیر یہ دن بھی گذر گئے چند ہی مہینوں کے بعد ہم نے یہ واقعہ بھلا دیا
والدین نے عزیزوں ہی میں ایک جگہ بات پکی کرلی تھی ہم نے
تعلیم ختم کرکے ملازمت کرلی تو والدہ ماجدہ جنت کو سدھار چکی تھیں
والد موجود تھے۔ اور صرف دو چھوٹے چھوٹے بھائی، والد نے اُن
لوگوں سے جہاں بات (جو صرف منہ زبانی حد تک) ہوئی تھی گفتگو
کی۔

لڑکی کے والد گزیٹیڈ آفیسر تھے ایک معزز عہدے پر مامور اور خاصے
متمول اور ذی رسوخ تھے، انہوں نے اپنی بیوی سے مشورہ کرنا
شروع کیا کہ کیا کیا جائے حسب ذیل سوالات پیش نظر تھے۔

(۱) صرف پچھتر ماہوار ملتے ہیں۔

(۲) والد کی ماہوار منصب تنخواہ کافی ہے مگر کب تک؟

(۳) لڑکا غصیل، ضدی، ہٹ دھرم، جھگڑالو، کاہل الوجود، عیش
پسند، شوقین ہے اسلئے نہ تو آئندہ ترقی کرنے کی امید ہے اور نہ موجودہ
آمدنی ہی اس کے اخراجات کو کفایت کرتی ہے!

(۴) لڑکے میں منجملہ اور چھوٹے چھوٹے نقائص کے ایک بڑا نقص یہ ہے کہ "سگریٹ کثرت سے پیتا ہے۔ ملحدانہ خیالات ہیں۔ نماز روزے کا پابند نہیں۔ بڑوں کا ادب چھوٹوں کا لحاظ نہیں کرتا۔ کپڑے لتے جوتا ٹوپی پر تنخواہ صرف کر دیتا ہے۔ گانے کا شوق ہے اور ہمیشہ رنڈیوں کا گانا سنتا ہے ممکن ہے کہ پیتا کھاتا بھی ہو۔"

(۵) راتوں کو گھر سے غائب رہتا ہے، لوگوں سے لڑتا جھگڑتا ہے احباب کی صحبتوں میں زیادہ وقت گزارتا ہے!

لہذا

"لڑکی کو روپے پیسے کھانے پینے، پہننے اوڑھنے کی تکلیف ہوگی اور ان عادات کی وجہ سے لڑکی خوش نہیں رہیگی۔"

پس

کسیطرح اس گفتگو کو ختم کرنا چاہیے اگر صاف انکار کردیں تو آپس کی کشیدگی اور شکر رنجی ہوگی عزیز داری میں ایسا ہونا اچھا نہیں۔ ابھی یہ لوگ غور ہی کر رہے تھے کہ ہمیں انکے خیالات کا علم ہوگیا اور ہم نے والد ماجد کو سارا قصہ سنا دیا اور یہ بھی عرض کیا کہ ہمیں اس جگہ شادی پسند نہیں براہ کرم آپ اُن سے ملکر فرما دیجئے کہ لڑکا ابھی شادی کرنا نہیں چاہتا اور شاید کوئی خاص لڑکی اس کے پیش نظر ہے اسلئے آپ اس فکر کو

دور فرما دیجئے اور لڑکی کی نسبت کسی اور جگہ کر دیجئے۔ والد قبلہ نے یہ دیکھکر کہ اگر میں ایسا نہ کہوں تو وہ لوگ صاف جواب دیدینگے جس سے خواہ مخواہ ملال ہوگا۔ اس لئے خود انہوں نے ہمارے مشورہ پر عمل کیا اور یہ جھگڑا مٹا، اس سے ہمیں خاصی کوفت ہوئی اور ایسا ہونا فطری تھا ہوتے کیا، صرف یہ کیا کہ شادی نہ کرنیکا عہد کر لیا، ڈیڑھ سال کے بعد والد نے ہمارے ننہالی عزیزوں میں سلسلہ جنبانی شروع کی خالہ اور خالو نے بھی انکا ساتھ دیا۔ بدنصیبی سے یہ لڑکی ہماری رشتے کی بہن تھی۔ ہمارے بغیر علم و اطلاع ان حضرات نے گفتگو شروع کی۔ لڑکی کے والد انتقال کر چکے تھے۔ والدہ باقی تھیں جو تھیں ذرا ہوشیار، جب ان لوگوں نے ان سے شادی کے متعلق گفتگو کی تو وہ راضی ہوگئیں مگر اقراری جواب بھی دینا پسند نہیں کیا ادھر انہیں کہدیا کہ ذرا سوچ کر جواب دینگے ادھر ہمیں کہلوا دیا کہ ایسا ہو رہا ہے۔ تم شادی کیلئے آمادہ ہو یا نہیں ہم تو تلے بیٹھے تھے شادی نہ کرنے پر جلدی سے انہیں لکھ بھیجا کہ ہم شادی کرنا نہیں چاہتے البتہ کبھی دل چاہے تو کسی اچھی گانیوالی طوائف سے عقد شرعی کر لیں گے۔ اُن محترمہ نے ہمارے تیور دیکھکر والد سے کہدیا کہ لڑکی کے دادھیالی رشتہ دار مجبور کر رہے ہیں کہ اسکی شادی چچا کے لڑکے سے کیجائے اس لئے میں مجبور ہوں والد قبلہ بھی خاموش

ہو رہے مگر انہیں ایک مستقل خیال ہماری شادی کا پیدا ہو گیا۔ چھ سات
مہینے کے بعد عزیزوں ہی میں ایک بزرگ سے گفتگو شروع کی جو مولوی
عالم اور مولوی فاضل ہونیکے علاوہ نہایت مذہبی اور گزشیڈ عہدے پر
فائز اور بھاری بھرکم (گراں ڈیل) تھے، یہاں بھی بلا استمزاج حقیر گفتگو
شروع ہوئی اور بات پکی ہو گئی۔ ہمیں جب اطلاع ملی تو ہم نے والد کی
ناراضگی کے خیال سے خاموشی اختیار کر لی اور ڈیڑھ دو مہینے کے بعد
آہستہ سے اُن بزرگ کے گھر مہمان ہو گئے، وہ اپنے مستقر پر تنہا تھے۔ ہمیں
دیکھکر بہت خوش ہوئے بڑی آؤ بھگت کی نہایت ہی خاطر داری کی
مگر ہم نے دن بھر ان کے ساتھ گزار کر رات کو انہیں خدا حافظ کہدیا
اور وہیں ایک دوست کے مکان پر جا کر "مجلس سرود" منعقد کی دو تین
رنڈیاں بلوالیں رات میں حضرت نے دیر تک انتظار کیا اور ہمیں
ڈھونڈھوایا تو پتہ چل گیا کہ ہم گانا سن رہے ہیں، آپ بہت ہی جھنجھلائے
ہم رات بھر کے جاگے ہوئے صبح ہو نیکے سو رہے حضرت نے دن بھر گفتگو
نہیں کی، دوسری رات بھی ہم نے ایسی ہی بسر کی اور صبح آ کر نہائے
ناشتہ کیا اور اپنا سوٹ کیس کھولکر کپڑے وغیرہ نکال کر اِدھر اُدھر
رکھے دو شیشے ایک "بئیر" کا اور ایک "وہسکی" کا ہم نے سوٹ کیس
میں رکھ چھوڑے تھے۔ ان دونوں کو بھی باہر پھینک دیا۔ اور پڑ کر

سو رہے نہ جانے کسی نے ان سے کہا یا خود انہوں نے دیکھا مگر انہیں ان دونوں شیشوں کا علم ہو گیا اور ان کے غصے کی انتہا نہیں رہی۔ اسی وقت والد کو تفصیلی خط لکھا جس میں ہماری بڑی تعریف کی تھی اور یہ بھی کہ آپ کسی اور جگہ انتظام کیجئے میں ایسے آوارہ لڑکے کو اپنی لڑکی نہیں دونگا۔

جب ہمیں یقین ہو گیا کہ بزرگوار کو ہماری ان حرکات سے کمال خوشنودی حاصل ہوئی ہے تو ہم نے دوسرے ہی روز کوچ بول دیا، وہ شیشے ہم نے سیٹرم اسٹیشن سے آگے بڑھتے ہی پھینک دیئے اور نہایت متانت سے مستقر پہنچ کر اپنے کاروبار میں مصروف ہو گئے والد قبلہ نے کئی روز تک گفتگو نہیں کی اور جب انہیں یہ معلوم ہوا کہ ہم نے محض اپنے آپ کو شرابی ظاہر کرنے کیلئے دو شیشے بھی ساتھ رکھکر ان بزرگ کے گھر پر قیام کیا تھا تو خوب بگڑے مگر کرتے کیا خاموش ہو رہے اور ہمیشہ کیلئے ہماری شادی کے مسئلہ کو ختم کر دیا۔ چنانچہ مرنے تک ہماری شادی کی کوشش نہیں کی البتہ انتقال سے چند روز پہلے نہایت ہی محبت سے ہمیں بلا کر کہا کہ "بیٹا شادی کر لو یہ میری آخری خواہش ہے کہ تمہیں دولہا بنا دیکھوں۔ اسکے بعد اطمینان سے مر جاؤں گا۔ ہمنے بکمال سعادت مندی فوراً آمادگی ظاہر کی اور

یہ کہا کہ آپکے صحت یاب ہوتے ہی شادی کی فکر کریں گے مگر اجل نے انہیں مہلت نہیں دی اور ہماری شادی کا ارمان دل ہی دل میں لئے جاں بحق ہوئے۔ والد مرحوم کے وصال کے بعد ہمنے "بین الاقوامی شادی" کی ٹھان لی ان دنوں "انٹرنیشنل میریج" کا خوب چرچا تھا چند مہینے پونے کی سڑکیں ناپیں۔ مراہٹہ تعلیم یافتہ خواتین سے راہ و رسم پیدا کئے مگر دو ڈھائی مہینے کے بعد ہی یہ جنون جاتا رہا اور ہمیں کچھ خیال انگلو انڈین سے عقد شرعی کرنیکا پیدا ہوا۔ بعض تو عیسائی شدہ احباب سے اس کا اظہار کیا تو انھوں نے اس خیال سے باز رکھا اور ہم کورے کے کورے رہ گئے۔

چونکہ ہمنے ایک شاعر کے گھر میں جنم لیا تھا اور ہمارے دادا پر دادا بھی شاعر تھے اسلئے شاعری ہمیں ترکے میں ملی تھی جس کے ساتھ عاشق مزاجی بھی آگئی۔ چنانچہ ہماری عاشق مزاجی میں فرق نہیں آنے پایا، بدنصیبی کہیئے یا خوش نصیبی کہ انہیں دنوں میں ایک جگہ دل بستگی ہوگئی مگر چند ہی روز کے بعد افتراق پیدا ہوگیا اور ایک طوطا چشم نے بکمال بے مروتی آنکھیں پھیرلیں۔ اسوقت ہمیں معلوم ہوا کہ عورت کسقدر خود غرض، لالچی، اور غیر وفا شعار ہوتی ہے اس کے بعد ہمنے حتمی ارادہ کر لیا کہ نہ تو کسی چونڈے والی سے دل لگائیں گے اور نہ ہی شادی

کریں گے، اسوقت ہمیں "پنچ مِتر" کا یہ مقولہ یاد آتا تھا کہ
"عورت ایک سے بات کرتی ہے تو دوسرے کی طرف اضطراب
کی نگاہ سے دیکھتی ہے اور دھیان اس کا تیسرے کی طرف ہوتا ہے"
"ہِتو اُپدیش" کے اس خیال سے بھی ہمیں کامل اتفاق تھا کہ
"عورت ہمیشہ بیوفا ہوتی ہے۔ حتیٰ کہ لوگ کہتے ہیں کہ دیوتاؤں
کی استریوں (عورتوں) کا بھی یہی حال ہے اگر کوئی عورت پاک
دامن ہے تو اُسکی وجہ یہ نہیں کہ وہ عفت مآب ہے بلکہ صرف یہی کہ
اس سے کوئی کسی عنایت کا طلبگار نہیں ہوا" تلسی داس کا یہ قول
ہمیں یاد آتا تھا کہ
"عورت کے چرتروں کا سمندر ایسا گہرا ہے کہ اسکی تہہ نہیں ملتی"
عورت کے خلاف جتنے مقولے تھے ہم نے سب "منہ زبانی" یاد کرلیئے
تھے اور ہمیشہ ان کا ورد ہوتا رہتا تھا۔ مگر جب تک زمین نے اپنے محور
کے گرد صرف تین گردشیں کی تھیں کہ پھر کسی کے گیسوئے مشکین نے پھانس
لیا اور ع۔
بڑا بول آگے آیا ہم جو بولے تھے لڑکپن میں
اسوقت ہم نے محسوس کرنا شروع کیا کہ عورت "تاج آفرینش" ہے بہترین
اور آخرین تحفہ آسمانی ہے "زمین کی فرشتہ" خدا کی ذات کی دلرباترین

اور یکتا ترین پرتو ہے،، ایک ایسی مخلوق ہے جسمیں لطیف ترین اور صمیم ترین
جذبات ودیعت کئے گئے ہیں۔ اس کا وجود تقدیس اور تعظیم کیلئے ہے
بہرحال اس دلربائی کے رازِ سربستہ کو جس کا دروازہ مقفل ہے ہمنے بہت
کچھ سمجھ لیا تھا مگر قسمت ــــ موت نے ایک دائمی پردہ حائل کر دیا اور
ہم رو پیٹ کر بیٹھ رہے۔ چار چھ مہینے سوگ منایا۔ اور نہایت خاموش
زندگی بسر کرنی شروع کی چند دنوں عورت کا خیال تک دل میں نہ آتا تھا
مرحومہ کے بعد کوئی ہستی ہی عورت کی پیش نظر نہ تھی۔ مگر آہستہ آہستہ یہ بات
بھی جاتی رہی۔ زندگی میں ایک خلا محسوس ہونے لگا ایک کمی نظر آنے لگی
اور ایک چیز ایسی خیال میں آتی تھی جو موجود نہ تھی، یہ تھی دماغی حالت
مگر ضروریات زندگی نے بھی اس کی تائید شروع کی، بچپن سے ہم
تنہا رہنے کے عادی تھے صرف دو کمرے ہمارے لئے کافی ہوتے تھے
ایک کمرے میں بیٹھتے اٹھتے پڑھتے لکھتے اور دوسرے کمرے میں سوتے
تھے اور اسی کمرے میں سارا سامان رکھا تھا۔ جب تک ہم یونہی زندگی
بسر کرتے رہے مگر بے انتہا تکلیف ہونے لگی۔ دو دو دن کمرا نہیں جھاڑا
جاتا تھا۔ کتابوں پر گرد جمی رہتی تھی۔ جوتے کوئی بھی صاف نہیں کرتا تھا۔
کپڑے بڑی بے احتیاطی سے پڑے خراب ہوتے تھے۔ کھانے پینے کی
تکلیف الگ تھی۔ دوست احباب عزیز و اقارب سبھوں کا یہی مشورہ

ہوتا کہ شادی کرلو۔ آخر ہم نے تھک کر اپنی برادری کا جائزہ لیا اور "قرعۂ فال"
ان محترمہ کے نام نکلا جواب ہمارے پلّے منڈھی ہوئی ہیں۔
ہم نے خانہ بردوش زندگی اور روز کی کوفت سے تنگ آکر
ایک روز اپنی خالہ صاحبہ (جواب خوشدامن ہیں) سے جا کر بکمال سعادت
مندی کہا کہ ہمیں اپنی فرزندی میں قبول فرمائیے۔ پہلے تو انھوں نے
اُسے دل لگی ہی خیال کیا مگر جب ہم دیر تک یہی الاپتے رہے تو کہا میاں!
کسی اور سے کہلوایا ہوتا۔ آخر اتنے عزیز و اقارب ہیں خالہ۔ خالو۔ چچا
چچی کسی کو بھی کہتے وہ آکر مانگتے۔ بھلا یہ کیا طریقہ ہے۔ ہم نے کہا جی حضور
شادی کریں گے ہم، آپ بیٹی دینگی ہمیں پھر یہ تیسرے آدمیوں کا توسط
کیوں؟ خیر بڑی رد و قدح کے بعد یہ طے ہوا کہ ہماری خالہ جان (جو ہماری
خوشدامن صاحبہ کی خالہ زاد بہن اور ہماری حقیقی خالہ تھیں) گفتگو کریں
چنانچہ ایسا ہی ہوا اور بات ٹھہر گئی۔ لگیں رسم کی تیاریاں ہونے دو
تین وقت منگنی کی تاریخیں مقرر ہو کر بدل گئیں بالآخر منگنی کی رسم
ادا ہوئی اور باضابطہ معاملہ طے پا گیا۔
منگنی کے بعد سے ہماری محترمہ ہونے والی بیگم صاحبہ کے مزاج ہی
بدل گئے۔ جس دن سے گفتگو ہوئی تھی اُس دن سے وہ ہم سے پردہ
کرنے لگیں تھیں منگنی کے بعد سے تو اور "گاڑھا پردہ" ہونے لگا جب بھی

ہم گھر جاتے وہ کسی کمرے میں جا بیٹھتیں اور اندر سے قفل پڑ جاتا۔ جب تک ہم
رہتے قفل نہیں کھلتا، یہ پردہ صرف ہمیں سے نہیں، ہمارے بھائیوں اور
عزیزوں سے لیکر ہماری ماماؤں سے تک ہوتا۔ خدا رکھے ہماری بڑی سالی
کو بیچاری بڑی سمجھدار لڑکی ہے۔ اس نے لاکھ سمجھایا منایا کہ ان خرافات کو
چھوڑے مگر "بیوی راضی نہوئیں" نہ صرف انہوں نے پردہ کرنیکی ٹھان لی
بلکہ بعض ایسی حرکات بھی سرزد ہونے لگیں جن پر دیوانگی کا شبہ ہوتا تھا۔
خاندان میں چھوٹے چھوٹے بچے بچیاں تھیں، جن بچوں کو ہم کبھی
پیار کیا کرتے تھے اُن کو یہ پاس بھی پھٹکنے نہیں دیتی تھیں اس لئے کہ
ہم پیار کرتے ہیں، دیکھئے کس قدر شدید رقابت تھی۔

انہیں معلوم ہوتا کہ ہم دیوان خانے میں بیٹھے ہوئے ہیں تو
کمرے میں گھس کر اندر سے بند کر لیتیں، اگر کوئی ہمارا نام لیتا تو اس سے
گفتگو کرنا چھوڑ دیتیں ہم کوئی کتاب بھولتے تو اس کو ہاتھ تک نہیں
لگاتیں۔ کسی دن ہم ان کے گھر پر کھا لیتے یا چائے پی لیتے تو وہ اس روز
چائے پیتیں نہ کھانا کھاتیں۔

ایک روز انکی بھاوج نے (جو ہماری بھی بھاوج ہیں) ایک رسالہ
جسمیں ہمارا ایک ظریفانہ مضمون تھا ورق الٹ کر اور مضمون کی سرخی
بتلا کر دیدیا کہ اسے پڑھو بڑا دلچسپ مضمون ہے۔ بیگم صاحبہ نے مضمون پڑھنا

شروع کیا بہ آواز بلند پڑھکر سبھوں کو لگیں سنانے دو تین ورق پڑھ ڈالے
چوتھا ورق جو اُلٹا تو چند سطریں پڑھنے کے بعد ہمارا نام نظر آیا بس سالہ
پھینک لگیں رونے اور روتے ہوئے کمرے میں جا کر بیٹھ رہیں اور رات کا
کھانا تک نہیں کھایا۔

خیر یہ تو ایک جملۂ معترضہ تھا مگر ہم کہنا یہ چاہتے تھے کہ ہم کو شادی
کی آرزو تھی اور اس سے بڑی بڑی توقعات تھیں۔ خصوصاً جب کبھی
ہم بیمار ہوتے، شادی نہ کرنے پر افسوس ہوتا۔ جب کبھی وقت پر اچھا
کھانا نہ ملتا تو ہم اسے جورو کی غیر موجودگی کا سبب سمجھتے، جب کبھی تھکے
ماندے گھر آتے اور کتاب دیکھنے کو دل چاہتا نہ مضمون لکھا جاتا تو ہم
آرام کرسی پر لیٹ کر اپنے آپ پر نفرین کرنے لگتے کہ کیوں شادی
نہیں کی۔ جب کبھی سکندرآباد جاتے اور واپسی پر حسین ساگر کے
کٹے (بند) پر مخالف ہوا ہماری سائیکل کو روکنے لگتی تو اپنی اس حماقت
پر بڑی کوفت ہوتی کہ ہم نے کیوں شادی نہیں کی ورنہ جہیز میں کم
از کم موٹر سائیکل ضرور ملجاتی جب کبھی کسی شریف آدمی کو اپنی بیوی کو
ساتھ لئے سینما آتے یا جاتے دیکھتے تو بے انتہا کوفت ہوتی کہ کیوں
ہم ایسے نہ ہوئے بدنصیبی سے بعض ایسی خواتین سے اور ہم سے
خط و کتابت بھی جو ہمیں صرف "مولانا" سمجھے ہوئے تھیں اور کوئی

بڑا ہی سِن رسیدہ مجمع ہمّہم، ریٹائرڈ ٹیل، مدرسہ نظامیہ یا دیوبند، یا سہارنپور کا فارغ التحصیل خیال کرتی تھیں، وہ جب کبھی خط لکھتیں تو "بیگم تمکین" کو آداب فرمائیے تسلیمات فرمائیے، مزاج پوچھتے خیریت لکھئے ضرور لکھتیں، ہم بکمال دروغ بافی یا دروغ گوئی یا دروغ نویسی بہ اطمینان تمام لکھ دیتے کہ سلام کہتی ہیں۔ آداب عرض کرتی ہیں، عافیت سے ہیں کی رہین منت ہیں۔ مہربانی کا شکریہ ادا کرتی ہیں مگر واقعہ یہ تھا کہ بیگم صاحبہ تھیں ہی نہیں۔ اکثر دوست احباب جو ذرا کم ملنے والے تھے یہی سمجھتے تھے کہ ہم شادی شدہ ہیں ہماری عافیت کے ساتھ بیگم صاحبہ کی خیریت بھی پوچھ بیٹھتے اور ہم بکمال تیزی یا صفائی کہہ دیتے کہ اچھی ہیں۔ ایک رسالہ کی مدیرہ نے بڑی متانت سے بیگم تمکین کے نام پہلے تو رسالہ روانہ فرمانا شروع کیا دو چار پرچے بھیج کر آپ نے ایک خط لکھا کہ "محترمہ مضمون روانہ فرمائیے" ہم نے بھی ایک عدد مضمون اپنی فرضی محترمہ کے نام سے بھیج دیا اور مدت تک بھیجتے رہے۔ نظام ساگر کنال پر ایک مہاراج جو سررشتہ تعمیرات میں ملازم اور لاہور کے باشندے تھے تشریف رکھتے تھے اسی رسالے میں آپ نے بھی فرضی عورت کے نام سے مضمون نگاری شروع کی اور اسی سلسلہ میں بیگم تمکین سے خط و کتابت شروع ہوئی۔

ایک ہندو دیوی[1] کے خطوط محترمہ کے نام بڑے ہی محبت بھرے وصول ہونے لگے ہم پہلے ہی سے سمجھے ہوئے تھے کہ کیا معاملہ ہے بعد میں جو دریافت کیا تو پتہ چلا کہ راجہ جی بہ یک بینی و دو گوش تن تنہا واقع ہوئے ہیں اور فرضی نام سے مضمون لکھتے اور خط و کتابت کرتے ہیں چنانچہ ہم نے ایک دفعہ بیگم صاحبہ بن کر لکھ مارا کہ "بہن میں اپنے شوہر کے ہمراہ نظام ساگر دیکھنے آ رہی ہوں اور آپ کی مہماں ہوں گی آپ میری رہائش کا انتظام کر سکیں گی یا کیا؟

مہاراج نے خط لیکر پڑھا اور پھر پھٹے ہوئے لفافے کو جوڑ کر پوسٹ من سے اس پر یہ لکھوا کر کہ "مکتوب الیہ نہیں ہیں" واپس کرا دیا اور اس دن سے آجتک کبھی بیگم تمکین کو خط نہیں لکھا ہم نے جب اس واقعہ کو شہرت دی اور ان کے آفیسرز کو یہ راز معلوم ہو گیا اور ایک بزرگ ان کے سخت مخالف ہو گئے تو انہوں نے کوشش کر کے آرایش بلدہ میں منتقلی کرالی نہ جانے اب کہاں ہیں۔ ایک دفعہ ہم سفر کر رہے تھے واڑی جنکشن پر "زنانہ سیکنڈ کلاس" کے ڈبے میں ایک بھورے بھورے بالوں والا، پھولے پھولے گالوں والا، بھرے بھرے جسم کا چھوٹا سا لڑکا نظر آیا ہم نے کھڑکی کے پاس پہونچکر اُسے بلایا تو آ گیا، گود میں اٹھا کر لگے پلیٹ فارم پر ٹہلنے، چونکہ بچہ اچھا

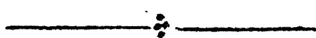
---

[1] چاند کے ایڈیٹر نمبر میں، انہیں دیوی صاحبہ کی تصویر بھی شایع ہوئی ہے

اور صحت مند تھا اس لئے ہر شخص اسے دیکھتا اور پوچھتا "کیا آپ کے
صاحبزادے ہیں؟" اور ہم ذرا شرما کر ہنس دیتے ہم نے تو جواب جاہلانہ
سمجھ کر خاموشی اختیار کی تھی مگر ان جاہلوں نے نیم رضامندی یا
"اعتراف پدریت" سمجھکر اس پرائے بچے کو ہمارا قرار دے لیا پھر
کیا تھا جو شخص بھی ملتا کہتا "اچھا آپ معہ زنانہ سفر کر رہے ہیں؟" کوئی
کہتا "اماں! مدت کے بعد تم زنانہ مستقر پر لئے جا رہے ہو۔ اچھا بھی ہے؟
حیدر آباد کی آب وہوا خراب بھی تو ہے؟" کوئی کہتا "بھائی گرمی کے
دنوں میں زنانہ کیوں لے جا رہے ہو گلبرگہ میں شدید گرمی ہوتی ہے
گرمی کے بعد لیجاتے؟" جتنے منہ اتنی باتیں ہم سنتے اور خاموش رہجاتے
ایک کرم فرما نے جو "منوال" کے رہنے والے تھے بچے کو دیکھا تو
زنانے کے ساتھ ہونے کا یقین کرتے ہوئے کہا "یار پان کھلوادو"
ہم نے جیب سے ڈبیہ نکال کر تواضع کرنی چاہی مگر وہ اڑے رہے کہ
نہیں "بھاوج کے ہاتھ کا لگا ہوا تازہ پان ہو؟" ہمیں بھی شرارت
سوجھی دوڑ کر تھوڑا سا میوہ خریدا پیپرمنٹ اور مٹھائی بھی لی اور بچے
کو ریل کے ڈبے میں پہونچا کر پیار کرتے ہوئے کہا میاں دو پان تو
منوا دو، اندر سے تھوڑی دیر کے بعد ایک کالی کلوٹی آیا نے ایک
نہایت نفیس چاندی کی نقشی ڈبیا بڑھادی جس میں چار پان دو

کتھے اور دو چونے کے الگ الگ لگے ہوئے تھے ہمارے مہربان بہت بگڑے کہ یار سو کھے کتھے کے پان کون کھائے۔ ہم نے کہا بھیّا تمہاری بھاوج ٹھیٹھ دکنی ہیں وہ پان میں پکا ہوا کتھا نہیں کھاتیں پھر تمہیں کہاں سے لادیں چونکہ پان بکّے اور خوبصورت بیڑے بنے ہوئے تھے اس واسطے حضرت کھا گئے ہمنے کہا چلو رسیدہ بود بلائے ولے بخیر گذشت۔ اسی طرح اکثر احباب کو ہمارے شادی شدہ ہونیکا یقین تھا۔ مگر جب کبھی وہ لوگ اپنے ایقان کا اظہار کرتے ہیں سخت تکلیف ہوتی اور نہایت حسرت سے دل ہی دل میں کہتے کہ کاش ایسا ہوتا۔

اسی کوفت کو مٹانے کیلئے ہم نے شادی کی ٹھان لی اور منگنی بھی ہوگئی مگر واقعات کچھ ایسے پیش آتے رہے کہ شادی بڑھنے لگی کبھی ربیع الاوّل میں کبھی ذالحجہ میں بہرحال ایک مدت تک یہی حال رہا۔



خان صاحب

لوگ کسی خبیث بوڑھے کو دیکھتے ہیں کہ "ایسے   رزق ہے نہ موت"
بالکل یہی حال ہمارے خانصاحب کا ہے۔ ساٹھ سال کی عمر کمر جھک گئی ہے،
پیٹ اکڑ گئی ہے۔ جوڑ جوڑ میں درد ہے بال پک گئے ہیں چہرے پر
جھریاں آگئی ہیں۔ گال پچک گئے ہیں۔ دانت گرے مدت ہوئی دو
چار چوکڑے (مصنوعی دانت) بدل چکے ہیں، مگر ہیں   بزعم خود جوان
دو شادیاں کیں اور دو ہی نکاح کئے۔ ان چاروں نیک بختوں کو
قبرستان پہونچا دیا۔ عزیز، قرابت دار، خویش و اقارب کوئی باقی
نہیں رہا اپنے خاندان میں فقط آپ ہی آپ وحدہٗ لاشریک لہٗ ہو کر
رہ گئے چنانچہ اسی لئے یہ مصرعہ ہمیشہ تلاوت فرمایا کرتے ہیں کہ ع

ایک میں ہوں یا خدا کی ذات ہے

مشہور ہے کہ خانصاحب نے مدتوں شاعری کی خصوصاً ایک واقعہ

بہت مشہور ہے یہ کہ ایک دفعہ خانصاحب نواب ....
بہادر کے پاس پہنچے۔ نواب صاحب آپکی بہت قدر کرتے تھے۔ دس
بجے سے بارہ بجے تک بیٹھے رہے۔ بارہ بجے نواب صاحب کا
خاصا چنا گیا محل سے چوبدار نے آکر اطلاع دی کہ حضور خاصہ تیار ہے
نواب صاحب نے خانصاحب کو رخصت فرمایا خود محل کیطرف
تشریف لے چلے ابھی زنانی دروازے تک پہونچے بھی نہ تھے کہ
خانصاحب نے بڑھ کر عرض کیا حضور سے کچھ عرض کرنا تھا۔ نواب
صاحب ٹھہر گئے فرمایا کہو عرض کیا حضور تشریف رکھیں تو عرض کروں
نواب صاحب پھر واپس ہوئے آکر اپنی جگہ بیٹھ گئے خانصاحب نے
عرض کیا حضور خانہ زادِ موروثی نے ایک شعر عرض کیا ہے بالکل نئی
بندش، نیا مضمون اور نئی زمین ہے، نواب صاحب کا اشتیاق
اور بڑھا فرمایا سناؤ پھر تو خانصاحب نے تعریف کے پل باندھ دیئے
کہنا شروع کیا۔ خداوند یہ جو دہلی کے داغ صاحب ہیں اور یہ جو
امیر مینائی مشہور ہیں، بھلا شعر کیا جانیں۔ علوی اور مسکین کو شاعری سے
تعلق کیا ہے۔ شعر کہنا تو کچھ خانہ زادوں ہی کا کام ہے۔ ملاحظہ ہو
کیا شعر عرض کیا ہے۔ ابھی خانصاحب کی بکواس جاری تھی کہ اندر سے
ایک ماما نے آکر عرض کیا کہ سرکار خاصہ تیار ہے مگر نواب صاحب

"ہوں"! کہکر پھر خانصاحب کی طرف متوجہ ہو گئے اور خانصاحب نے
پھر وہی تعریف شروع کی ایک بج گیا۔ مگر تعریف ختم نہیں ہوئی ڈیڑھ
بجے نواب صاحب نے شدت اشتہا سے بیچین ہو کر فرمایا اجی خانصاحب
شعر سنا دیجئے مجھے اندر جانا ہے۔ بس پھر کیا تھا خانصاحب دو زانو
ہو کر بیٹھ گئے عبا ہی کو بازو سے لیکر سامنے رکھ لیا دستار سیدھی کی مگر کا
بگلوس برابر کیا۔ انگرکھے کی جھریاں درست کیں اور کھنکار کر حلق صاف
کیا تنتے ہوئے مسکرا کر کہا حضور ایسا شعر کوئی کہہ لے تو میں جانوں
میرا دعوے ہے کہ داغ، امیر، میر، علوی، میکش، سے لیکر برتر، بازغ
ناظم، کیفی، تجلی، ہست، رسوا، جیب، ضیغم، کوئی تو ایسا ایک مصرعہ
کہہ لے۔ اسی گفتگو میں دو بج گئے اور مارے بھوک کے نواب صاحب کا
بُرا حال ہو گیا۔ نواب صاحب نے بیچین ہو کر فرمایا اجی خانصاحب
شعر ایسا ہی ہوگا مگر سنائیے تو، پھر خانصاحب نے گلا صاف کیا
اور گنگنا کر حافظہ پر بار ڈالا مگر کچھ نہیں ادھر نواب صاحب متقاضی
کہ جلد شعر سنائیے ادھر خانصاحب متلاشی کہ شعر یاد آ جائے۔ انتہا
یہ کہ ڈھائی بج گئے اور خانصاحب کو شعر یاد نہ آیا۔ مجبوراً عرض کیا
حضور اسوقت حافظہ سے اتر گیا ہے کل انشاء اللہ عرض کروں گا
نواب صاحب کا بھوک کے مارے بُرا حال تھا، مگر خاموش ہو رہے

مسکراتے ہوئے محل میں تشریف لے گئے۔

خانصاحب کا دیوان بھی مشہور ہے ایک بزرگ فرماتے تھے کہ
خانصاحب نے ایک دفعہ ایک بڑے شاعر کو گانٹھا اور گھر لیجا کر لگے
گپ کرنے انہوں نے شعر سنانے کی فرمایش کی تو آپ نے اندر سے
ایک قلمدان منگوایا اسے کھولکر ایک چھینٹ کا بستہ نکالا جسے کھولا تو
ایک مدھرے کا جزودان نکلا اسمیں سے ایک مخمل کا جزودان برآمد ہوا
اور مخمل کے جزدان میں سے ایک باریک ریشم کا جزودان نکالا گیا
جس میں ایک چھوٹی سی بیاض مطلا مذہب جلد کی نکلی خانصاحب نے
پہلے تو بہت کچھ انکسار فرمایا اور پھر شعر سنایا۔

جو سڑک جاتی ہے مدینے کو

سننے والا منتظر کہ دوسرا مصرعہ بھی سن لے تو داد دے اور
خانصاحب بیچین کہ داد مل جائے تو دوسرا شعر سناؤں آخر جھلا نے
اکتا کر کہا خانصاحب مصرع ثانی ارشاد ہو۔ بس خانصاحب کے
آگ لگ گئی فرمانے لگے یار تمہیں شاعر کس مردود نے بنا ڈالا تم ا
حجام ہو میں پورا شعر سنا رہا ہوں اور آپ مصرع ثانی کی فرمایش
کرتے ہیں جنگلی کہیں کے! غصہ میں آکر اپنی بیاض کو پھر جزودان
در جزودان کرکے قلمدان میں رکھدیا اور خود دیوانخانے سے

چلے گئے۔ سنا ہے کہ پھر کبھی اُن صاحب سے ملاقات نہیں کی اور نہ انکو شاعر کہا۔ ہمیشہ کہا کرتے تھے کہ وہ تو جنگلی ہے جنگلی۔

مشہور ہے کہ خانصاحب جوانی میں بہت تنتے پھرتے تھے۔ روزانہ پانچ بجے ہتیار لگاکر بانکے جواں بن کر گھوڑے پر سوار ہو کر چارمینار کا ایک چکر ضرور کاٹتے، ایکدفعہ خانصاحب شربتی ململ کا انگرکھا اونچی چولی والا پہنے ناندیڑی کلی کا سیلا باندھے کمر میں کٹار لگائے ڈاب میں عباسی ڈالے ایک مشکی گھوڑے پر سوار گھوڑا اڑاتے ہوئے چارمینار کے پاس پہنچے اس زمانے میں چارمینار کے اطراف کے بنگلوں (کوٹھوں) میں رنڈیاں تھیں، ایک بی جان کھڑی ہوئی سڑک کا نظارہ کر رہی تھیں کہ خانصاحب کا گھوڑا انکے کوٹھے کے نیچے پہنچا بی جان نے جھک کر بندگی کی خانصاحب نے سلام لینے کیلئے ہاتھ اٹھایا تو لگام ڈھیلی ہوئی اور گھوڑے نے ٹھوکر لی خانصاحب نے باگیں کھینچ کر گھوڑے کو رانوں میں مسلا اور کوڑا کیا اس گڑبڑ میں گھوڑے سے ریح صادر ہوگئی۔ آواز سنکر بی جان لگیں مسکرانے خانصاحب نے مونچھیں چڑھاتے ہوئے فرمایا "مردانِ عالم جس پر سواری کرتے ہیں اُسے پدا دیتے ہیں" بی جان نے مسکرا کر ہاتھ جوڑ کر کہا "حضور گھروالی بدن ہوگئی ہوگی" شہر کے بیکاروں کا تو یہ اڈاہی تھا

سینکڑوں بانکے نوجوان کوٹھوں کے نیچے کھڑے تھے۔ انہوں نے
یہ فقرہ سنا تو لوٹ گئے وہ وہ پھبتیاں اڑائیں کہ خانصاحب بوکھلا گئے
اور گھوڑا الٹا کر گھر کا رخ کیا اُسدن سے آجتک پھر چارمینار کیطرف نہیں گئے
منصب کے علاوہ خانصاحب کی جاگیر بھی تھی اور دو ایک
چھوٹے چھوٹے مقطع (موضع) بھی تھے تنہائی سے اکتا کر خانصاحب نے
شادی کی فکر کی تو بعض حریصوں نے یہ سمجھ کر کہ بوڑھا آجکل میں مرنے
والا ہے اپنی نوجوان لڑکیوں کو دولت کی بھینٹ چڑھانا چاہا نتیجہ
ایک نوجوان لڑکی سے خانصاحب کی شادی نہایت دھوم دھام
سے ہوئی اس تقریب میں لوگوں نے سہرے قصیدے، قطعات اور
رباعیات اتنے لکھے کہ اگر ان کا مجموعہ شائع کیا جائے تو ایک خاصی
کتاب یا شادی نمبر ہو جائیگا۔ چنانچہ ایک صاحب نے ایک قطعہ
لکھتے ہوئے یہ مصرعہ بھی لکھدیا ع۔

صدوسی سال کا نر پانچ برس کی مادہ

خانصاحب کی دوسری جمعگی کے روز ایک صاحب نے ایک طویل
نظم پڑھی جس کا ایک شعر یہ تھا۔

ستم ہے ایسی زوجہ پر تاسف ایسے شوہر پر — یہ آمادہ ہے مدت سے تو وہ بیکار بیٹھے ہیں

بہرحال جتنے منہ اتنی باتیں ہوئیں مگر واقعہ یہ ہے کہ شادی کر

پہلے خانصاحب نے مراد آباد کی مردہ زندہ کرنیوالی دوا سے لیکر دوائے شاہ جہانی اور واجد علیشاہی تک منگوالیا تھا اور آتشک نگرہ گولیوں سے لیکر حکیم اجمل خانصاحب کے دواخانہ یونانی دہلی سے کشتۂ فولاد تک طلب کرلیا شہر کے سارے طبیبوں، عطائیوں، اناڑیوں، ڈاکٹروں حکیموں ویدوں سبھی سے نسخے لکھوائے مغز سر کنجشک خانگی، کا حلوا تیار ہوا اور نسخہ شاہجہانی کے طریقے پر "حلوۂ گزر" بنایا گیا" سانڈے کا تیل اور اجمل خانصاحب کی تکمید، تدبیریں اعلٰی سبھی چیزیں استعمال کی گئیں مگر

مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی

کا مصداق رہا خانصاحب پر کوئی بھی اثر نہ ہوا مشہور ہے کہ جلوے کی رات خانصاحب نے بڑی بے اطمینانی سے بسر کی اور فجر کی نماز بھی ادا کی جس کے لئے صرف وضو کرنے کی ضرورت پڑی غسل واجب ہی نہیں ہوا اس واقعہ کو سنکر ایک صاحب نے

شب زفاف و نماز سحر یہ خوب کہی

ایک غزل کی غزل کہدی۔

بیچاری دلہن اپنے جذبات کو روکتی رہی مگر کب تک آخر دق کا شکار ہو گئی۔ ایک سرخ و سفید رنگت والی۔ بھولے بھولے گالوں والی

کالے کاٹ بالوں والی بھرے بھرے جسم والی سترہ سالہ نوجوان لڑکی گھل گھل کر چھوٹی چالوں ہی میں آدھی رہ گئی پانچویں جھگی سے جو فرمائش ہوئی تو دس ہی بارہ مہینے میں ختم ہوگئی۔

مشہور ہے کہ خانصاحب نے شادی تو کرلی مگر انکی جان ضیق میں پڑ گئی تھی۔ رات یونہی انہیں نیند نہ آتی اگر وہ سو بھی جاتے تو دلہن جگادیتی اس سے نجات پانے کے لئے خانصاحب نے علیحدہ علیحدہ پلنگڑیاں (چارپائیاں) ڈلوادی تھیں اور ایک کمال یہ کرتے کہ دن بھر ہنسی خوشی رہتے مگر مغرب ہوتے ہی منہ پھلا لیتے اور رات کا کھانا کھاتے وقت کوئی نہ کوئی چھیڑ نکال کر بگڑ جاتے اور غصہ غصہ میں منہ لپیٹ کر پڑ رہتے اگر اس کے باوجود بھی وہ غریب کسی نہ کسی طرح انہیں جگادیتی تو کراہنے لگتے کبھی ڈاڑھ میں درد بتلا کر اسے پانی گرم کرانے کیلئے کہتے اور کبھی سر میں درد ظاہر کرکے اس غریب سے صندل گھسواتے آخر بیچاری کو مار کر دم لیا۔ فقط

تذکرہ ریختی

ادبیات اردو میں اصناف نظم و نثر سے اس قدر بے اعتنائی کی گئی کہ نہ تو
کسی خاص صنف ادب کے نثر نگاروں کا کوئی تذکرہ ہی شائع کیا گیا اور نہ شاعروں کا
اس کمی کو محسوس کر کے مولوی تمکین کاظمی نے ریختی شعر کہنے والے شعراء کا ایک نہایت
ہی عمدہ تذکرہ شائع کیا ہے اور ایک فاضلانہ مقدمہ بھی لکھا ہے جو بجائے خود ایک
مستقل تصنیف ہے اور ابتدائے ایجاد ریختی سے اب تک کے کل شعراء کے حالات
اور کلام کے عمدہ نمونے دئے گئے ہیں۔ لکھائی چھپائی عمدہ کاغذ نفیس قیمت (عہ)

ارنسٹ

انگلستان کے مشہور ادیب آسکر وائیلڈ کے شہرۂ آفاق شاہکار
"دی امپارٹنس آف بی انگ ارنسٹ" کا سلیس اور عمدہ ترجمہ مولوی تمکین کاظمی
اور مولوی سعیدی نے کیا ہے۔ اس پر ملک کے مشہور انشاپردازوں نے
بہترین رائیں لکھی ہیں جو کتاب کے ساتھ شریک ہیں۔ آسکر وائیلڈ اور مترجم
صاحبان کے تصاویر بھی ہیں لکھائی چھپائی عمدہ کاغذ نفیس قیمت (عہ)

ملنے کا پتہ

مکتبہ ابراہیمیہ (محدود) اسٹیشن روڈ حیدرآباد دکن

مطبوعہ شمس الاسلام پریس حیدرآباد دکن